بلوچ تاریخ کے نئے پہلو

پناہ بلوچ

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

عدالت روڈ، کوئٹہ

(c) All rights are reserved.

اے کتابءِ درائیں حقّ گوں بلوچی اکیڈمیءَ انت۔

بیدئے اکیڈمیءِ رضاءَ کسّ ایشیءِ مواداں چھاپ کُت نہ کنت۔

بلوچ تاریخ کے نئے پہلو

(تحقیق)

پناہ بلوچ

2020ء

ISBN # 978-969-680-112-2

قیمت= /200

بلوچی اکیڈمیءَ اے کتاب میراث پرنٹنگ پریس کراچیءَ چھاپ کنائینگءُ شنگ کتگ۔

فہرست

تاکدیم	عنوان	نمبر شمار
5	1۔ ...... تذکرہ بلوچ	
7	2۔ بلوچستان کا تہذیبی سفر	
19	3۔ بلوچ جغرافیہ اور مورخین	
54	4۔ بلوچ کون ہیں اور کہاں سے تعلق رکھتے ہیں	
63	5۔ شاہ لطیف کی شاعری میں تذکرہ بلوچ	
72	6۔ سبی، بلوچوں کا قدیم شہر	
92	7۔ میری کلات، بلوچ مرکزیت کا قدیم نشان	
104	8۔ بلوچستان کی قدیم بندرگاہیں	
114	9۔ بلوچستان کی قدیم غاریں	
125	10۔ لطیف کی شاعری میں سندھ بلوچستان کے رشتے	
137	11۔ ہربوئی.... خوشبوؤں سے مہکتی تاریخی وادی	
144	12۔ فتح پور کے صوفیا	
160	13۔ بلوچستان میں بزگر تحریک	
179	14۔ کتابیات	

☆☆☆

انتساب

بلوچی، بلوچ اور بلوچستان کے نام

تذکرہ بلوچ

بلوچ کا تذکرہ کوہ البرز کی پہاڑیوں سے ترکمانستان کے بلوچ علاقوں سے گزرتے افغانستان کے بلوچ علاقوں سے کوہ سلیمان جیسے بلند پہاڑ کے دامنوں سے رشتہ جوڑتے، دریائے سندھ کے مغربی علاقے سے گزر کرمائی کولاچی (کراچی) سے بحر بلوچ کے ساتھ چلتے چلتے ایرانی بلوچستان سے گزر کر کردوں کے علاقے سے ملحق شام کے شمال مغربی شہر حلب تک پھیلے ہوئے جغرافیائی حدود میں ملتا ہے۔ بلوچ تاریخ پر ابتدائی طور پر کام کرنے والے مورخین اور محققین نے سرسری معلومات کو بنیاد بنا کر انہیں اس خطے میں درآمد (غیر) قرار دے کر، پندرہویں صدی میں یہاں پر وارد ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ ہم ابھی تک ان کی سرسری معلومات پر مبنی بھول بھلیوں کا شکار رہے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ اس خطے کے بارے میں قدیم تاریخی دستاویزات جن میں فردوسی کا شاہنامہ، برہمن کا چچ نامہ، کردوں کا تاریخ مردوخ اور شرف نامہ، گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ، ہیروڈوٹس، ابن حوقل کا سفر نامہ، سکندر اعظم کی کہانی اور سائرس اعظم کا فسانہ چیخ چیخ کر بلوچوں کی اس خطے میں موجودگی کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔

بلوچستان کے طول وعرض، مہر گڑھ، سوردمب، دمب سادات، نال، ستنگگیں ڈھور، بارکھان، خاران، رخشان، مکران کی وادیوں تک پھیلے ہوئے تہذیبی آثار سے دستیاب ابتدائی شواہد بھی یہی سعی کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ بلوچوں کا ان

کے ساتھ قدیم تعلق موجود ہے۔ میری کیچ، میری کلات، خاران کلات، ہڑند کلات، اور چاکر قلعہ کے سمیت بلوچستان بھر میں درجنوں شکستہ، نیم شکستہ اور ٹیلوں میں تبدیل قلعے بھی یہی بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ بلوچ اس خطے کی قدیم تاریخ کے امین ہیں۔ اب ہمیں غیروں کے بنائے ابتدائی تحقیقی بھول بھلیوں سے نکلنا ہو گا۔ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق سہولیات کو استعمال کر کے بلوچ تاریخ کو از سر نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ اس کتاب میں موجود مواد نئے محققین کو رہنمائی فراہم کر سکیں گے کیونکہ میں نے بلوچ تاریخ کے چند پہلوؤں کو مندرجہ بالا تاریخی دستاویزات کو بنیاد بنا کر سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کامیابی وناکامی کا فیصلہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

پناہ بلوچ

یکم مئی 2019

بلوچستان کا تہذیبی سفر

بلوچستان میں گیارہ ہزار سال قدیم تہذیبوں کے امام ''مہر گڑھ'' کی دریافت نے دنیا کے آثار قدیمہ کے ماہرین اور تہذیب و تمدن کے شعبے سے تعلق رکھنے والے آموزدہ کاروں کو چونکا دیا ہے۔ اس سے قبل وادی مہران میں موہن جودڑو، ہڑپہ اور بلوچستان میں اسی دور کی وادی نال کی تہذیب کے ذخائر سے برآمد ہونے والے تہذیبی آثار کو بنیاد بنا کر تمدنی تاریخ بیان کی جارہی تھی۔ عراق کی تہذیب کو ان تہذیبوں کی ''ماں'' قرار دیا گیا تھا۔ جبکہ مہر گڑھ دریافت کے بعد ماہرین کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں اور واضح شہادتیں سامنے آئیں کہ قدیم تہذیبوں کی بنیادیں اور کسی مقام سے نہیں بلکہ بلوچستان سے پھوٹی ہیں۔ اس سے واضح طور پر عیاں ہوتا ہے۔ قدیم بلوچستان کی غیر نوشتہ تہذیبی تاریخ گیارہ ہزار سال قبل سے شروع ہوتی ہے۔ جہاں صنعت و حرفت کے ابتدائی نقوش کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ برتن سازی، چوب سازی، چمڑہ سازی، رنگ سازی، اناج و دیگر زمینی پیداوار کی فراوانی کے ساتھ ساتھ سول انجینئرنگ اور میڈیکل سائنسز کے شعبہ جات نے بھی ابتدائی ترقی کے منازل طے کرنے شروع کردیئے تھے۔ یہیں پر پتھر کے اوزاروں کی مدد سے دانتوں کی سرجری بھی ہوتی تھی۔ یعنی مہذب معاشرے کی بنیاد پڑی۔

بارکھان سے سات کروڑ سال قدیم ''پاکی سارس''، ''سُلیمانی سارس''، ''کھیترانی سارس''، ''مری سارس'' اور ''بلوچی سارس'' نامی ڈائنوسارز پانچ کروڑ سال قدیم وہیل مچھلی، ''روڈ ہوسی ٹس بلوچستانی سس'' ڈیرہ بگٹی سے تین کروڑ سال قدیم

"بلوچی تھریم" اور دو کروڑ سال قدیم "بگٹی لیمور" کے رکاز(Fossils) کی دریافت، دنیا کے قدیم ترین مذہبی اور روایتی نشان "سواستیکا" کے نشانات کے آثار قدیمہ کے باقیات میں ملنا اور تاحال اس کی عقیدتاً استعمال، یہاں کے تمدنی سفر کی قدامت کو واضح کرتے ہیں ان رکاز کے دریافت سے واضح ہوتا جاتا ہے کہ یہ علاقہ جانوروں کی افزائش کا بھی بنیادی مرکز رہا ہے۔

سندھ کے نامور محقق و مورخ اشتیاق انصاری لکھتے ہیں:

" ماہرین نے مہر گڑھ آثار قدیمہ کے مختلف ادوار دریافت کئے ہیں، خاص طور پر چوتھے دور کے تحقیق کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس شہر میں مہذب معاشرے کے ساتھ ساتھ خوبصورت منصوبہ بندی بھی واضح نظر آتی ہے۔ یہ وہ دور تھا کہ جب سندھ کی تہذیب گھٹنوں کے بل کھڑے ہونے کی کوشش میں مصروف عمل دکھائی دے رہی تھی۔ گمان ہے کہ کسی زمانے میں موسمی تبدیلیوں کے باعث بلوچستان کے لوگ قحط سالی کا شکار ہوکر وہاں سے ہجرت کرکے سندھ کے زرخیز علاقوں میں آباد ہوئے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ مہر گڑھ کو آباد کرنے والوں نے آہستہ آہستہ ہجرت کرکے یہاں "موئن جودڑو" کو آباد کیا۔ مہر گڑھ

وموئن جو دڑو سے قبل ہمیں سندھ وبلوچستان کے کھیر تھر اور اس کے گرد ونواح کے پہاڑی سلسلے میں ابتدائی انسانی سر گرمیاں دیکھنے کو ملتی ہیں، جب سندھ کے میدان سمندر کے اندر سوئے ہوئے تھے۔ اس دور میں کھیر تھر اور اس کے گرد ونواح کے پہاڑوں پر زرعی معاشرے کی کسی نہ کسی طور پر وجود میں نظر آتا ہے۔ ماہرین کی رائے ہے کہ برفانی دور کے خاتمے کے بعد چشموں کے کنارے گلہ بانی اور ابتدائی زرعی معاشرے نے جنم لے لیا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہاڑی تہذیب ہی قدیم تہذیب ہے اور سندھو کی میدانی تہذیب اس کے بعد کی تہذیب ہے"۔(1)

ڈاکٹر مبارک علی تہذیبی ارتقاء کے منازل کو یوں لکھتے ہیں:

"ابتداء میں انسان کی ترقی کی رفتار بہت سست تھی، یہ رفتار جدید پتھر کے زمانے میں آکر تیز ہوئی۔ قدیم پتھر کے زمانے میں اس کا سارا وقت اس فکر میں گزرتا تھا کہ غذاء کیسے حاصل کی جائے؟ خود کو زندہ کیسے رکھا جائے؟ اس مقصد کے لئے اس نے اوزار بنائے۔ مل کر رہنا سیکھا۔ آپس میں بولنا شروع کیا تاکہ مل جل کر حالات پر کیسے قابو پایا جائے۔ آٹھ ہزار قبل مسیح میں اس کی ترقی تیز ہوئی جو جدید پتھر کا زمانہ تھا، اب

وہ غذاء پیدا کرنے لگا تھا۔ برتنوں کو بھٹی میں پکا کر مضبوط
کرلیتا تھا۔ اب وہ ایک جگہ رہنے لگا۔ بستیاں آباد ہونے لگیں،
لوگ کھیتی باڑی میں مصروف ہوگئے۔ جب فرصت ملی تو علم
میں اضافہ ہوا۔ آرٹ، ادب، موسیقی کی ابتداء ہوئی۔ اس
مرحلے پر مختلف تہذیبیں ابھرنا شروع ہوئیں"۔(2)

دنیا میں تہذیب وتمدن کے ترقی کے سفر کی تشریح مورخین، محققین اور آثار قدیمہ کے ماہرین اس طرح سے کرتے ہیں۔ ابتدائی طور پر قدیم پتھر کا زمانہ ہے جو کہ بیس لاکھ قبل مسیح سے اسی ہزار قبل مسیح تک پھیلا ہوا ہے۔ پھر درمیانی پتھر کا دور ہے جو اسی ہزار سال قبل مسیح سے چالیس ہزار قبل مسیح پر مشتمل ہے۔ جدید پتھر کا زمانہ چالیس ہزار قبل مسیح سے دس ہزار قبل مسیح تک کا دور کہلاتا ہے۔ اس سے مراد مہر گڑھ جدید پتھر دور کے عروج کے زمانے کی دریافت ہے۔ پھر مراحل وار تبدیلیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ قدیم علم، فن، ہنر اور حاصل شدہ تجربات کے ساتھ انسان پانچ ہزار قبل مسیح میں تانبہ دریافت کرتا ہے۔ امیر توکل کمبوزیا نے لکھا ہے:

" تانبہ پہلی مرتبہ بلوچستان میں دریافت اور استعمال کیا گیا، جو کہ
بلوچستان سے عراق جہازوں کے ذریعے منتقل کیا جاتا تھا"۔(3)

پھر تانبے کو جست سے ملا کر کانسی کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے، جس کی ابتدائی آثار ہم کو تین ہزار پانچ سو قبل مسیح میں ملتے ہیں۔یوں ترقی کا مرحلہ پھر

تیزی سے شروع ہوتا ہے۔ وقت کا پہیہ آگے چلتا ہے بارہ سو قبل مسیح میں لوہے کے زمانے کے آغاز کے ساتھ جدید ترقی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔

نامور مورخ، محقق وماہرین آثار قدیمہ ڈاکٹر انجم رحمانی مہر گڑھ تمدن کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"فرانسیسی مشن نے جیراج کی سرکردگی میں مہر گڑھ سے جدید پتھر کے دور اور نوشارو(نوشہرو) ضلع کچھی سے ہڑپائی دور کے تمدنی آثار تلاش کیئے۔ ایل وینگلز نے اس ٹیم کے ممبر کی حیثیت سے درہ بولان کے قریب دریائے بولان کے کناروں سے قدیم پتھر کے دور کے درمیانی دورانئے کے اوزار دریافت کیئے۔ اس قسم کے یہ سات اوزار ہیں جن کو دوبارہ قابل استعمال بنانے کے لئے ٹھیک کیا گیا۔ وہ مزید لکھتے ہیں۔ مہر گڑھ کے ابتدائی دور میں انسان نے غذائی پیداوار کا آغاز کرکے ایک طرح سے ایک معاشی نظام قائم کرلیا تھا۔ اس دور میں اس نے تجارت اور خصوصی دستکاریوں کی بنیاد ڈال دی تھی، پھر اگلے پچیس سو سالوں میں انسان نے برتن ، مورتی سازی اور دھات کے اوزار بنائے۔ زیورات اور برتن بنانے کی مختلف تیکنیکیں ایجاد

کرلیں۔اسی طرح اس نے ایک مقامی رنگ کی طرز تعمیر بھی ایجاد کرلی۔ انسان نے کئی طرح کے جانور پالنے شروع کردیئے تھے، جن میں بیل، پانی کی بھینس، مینڈھا نمایاں ہیں۔اسی طرح اس نے سیپی، عقیق، تانبے اور سونے وغیرہ کے منکے اور چوڑیاں بنائیں۔ نیز انہوں نے سرخ دھاریوں اور کالے رنگ کے نقوش برتن، نیلے اور سبز رنگوں میں روغنی تہہ والی اشیاء اور روغنی پرت دار پتھر تیار کرنے شروع کردیئے تھے۔ہوسکتا ہے کہ ان کی پیداوار کے پیچھے ان کی روزمرہ زندگی کے ضروریات،مذہبی عقائد اور دوسرے اوہام کارفرماہوں۔ تاہم مہرگڑھ جنوبی ایشیاء میں پہلی انسانی آبادی ہے۔ اس طرح اس خطہ میں پہلا انسانی معاشرہ، معاشی سلسلہ اور تیکنیکی نظام قائم ہوا۔اسی طرح یہاں تجارت کے پہلے تانے بانے بھی قائم ہوئے۔بلوچستان میں سبی کے نزدیک ''پیرک'' کے مقام پر دریافت ہونے والے قبروں کے آثار سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ چاول، اروان، لوبیا اور باجرہ کی مختلف قسمیں کاشت کرتے تھے، جبکہ پیرک ہی سے 850 ق م کے دور میں لوہے کے دور کے آثار بھی ملتے ہیں''۔(4)

بلوچستان کے جدید دور کے مورخ و محقق فاروق بلوچ بلوچستان کے تہذیبی، سفر کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں:

" پہلے پہل جب بلوچستان میں آثار قدیمہ کے باقیات کی تفتیش کا کام شروع ہوا تو یہی خیال کیا گیا کہ بلوچستان کی قدیم تہذیب وثقافت پانچ ہزار سال قدیم ہے۔ماضی کے غیر تحقیقانہ دعوؤں کے برعکس مہر گڑھ کی دریافت ایک بہت بڑی کامیابی تھی کہ جس سے بلوچستان میں آثار قدیمہ کے حوالے سے مشہور علاقوں کی طرف غیر ملکی ماہرین کی ٹیمیں جوق در جوق پہنچنے لگیں اور آئے روز نت نئے انکشافات کے نتیجے میں یہ بات پایہ تکمیل تک پہنچی کہ بلوچستان کی قدیم تہذیب ہی نے وادی سندھ کی جدید تہذیب (موئن جودڑو اور ہڑپہ) کی بنیاد ڈالی۔ کیونکہ وادی سندھ کی قدیم دریافتوں میں ابھی تک ایسا کوئی دریافت سامنے نہیں آئی کہ قدامت میں بلوچستان کی تہذیب سے زیادہ پرانی ہو"۔(5)

مہر گڑھ کے دریافت سے قبل جنوب مغربی بلوچستان کے آثار قدیمہ کے بارے میں ش ضحی لکھتے ہیں:

" اس کلچر کی سب سے اہم یاد گار پکائی ہوئی مٹی کے وہ چھوٹے مجسمے ہیں جو تقریباً ہر مقام سے بر آمد ہوئے ہیں۔ ان

میں اکثر تو گائے بیل کے مجسمے ہیں لیکن زیادہ تعداد مورتیوں کی ان کے مصرف یا استعمال کے متعلق تو کچھ بھی نہیں کہاجاسکتا۔ لیکن ایک ہی قسم کی ان ''تصویروں'' کو تھوڑی دیر تک غور سے دیکھتے رہے تو ایسا معلوم ہو گا جیسے گہرے سانولے یا کالے رنگ، بھرے بھرے ہونٹوں ،دوشیزہ سینوں والی ایک ''جیتی جاگتی'' عورت پتلی کمر پر ہاتھ رکھے آپ کے سامنے کھڑی ہے۔ کلائیوں پر چوڑیاں اور بازوؤں پر ''بازوبند'' یا''جوشن'' پہنے ہوئے ہے۔ گلے میں کئی کئی لڑیوں کا ہار پڑا ہوا ہے اور بالوں کو یوں آراستہ کرر کھا ہے کہ سامنے کی طرف ایک بل کھائی ہوئی اونچی لہر بن گئی ہے۔ باقی کو ایک چوڑے تہہ کی صورت میں گردن پر چھوڑ دیا ہے۔ غور کیجئے! آج سے کوئی ساڑھے چار ہزار سال پہلے کی یہ ''مکرانی خاتون'' کتنی ''فیشن ایبل'' نظر آتی ہے!''۔(6)

1926ء میں ''موئن جودڑو'' سے دریافت ہونے والی کانسی کی گیارہ سینٹی میٹر نرتکہ کی مورتی کے متعلق برطانیہ کے مشہور ماہر آثار قدیمہ مورٹائمر وہیلر (Moretimer Wheeler) جن کی کوششوں یہ تمدنی خزانہ ہاتھ آیا تھا۔ وہ اس مجسمے کے بارے میں رقمطراز ہیں:

" یہ بلوچی انداز کا چہرہ ہے، بے باک اور بے ادب نظروں کے ساتھ باہر نکلے ہوئے ہونٹ بے زاری کا اظہار کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ پندرہ سال ہو گی۔ وہ اپنے اور دنیا کے بارے میں پر اعتماد نظر آتی ہے۔ اس لڑکی جیسی میرے خیال میں دنیا میں کوئی اور نہیں"۔(7)

بہت سے ماہرین نے بلوچستان پر کافی تحقیق کی ہے، ان کے مطابق دستیاب شواہد ظاہر کرتے ہیں کہ غاروں کے باسی اور شکاری ہزاروں سال تک بلوچستان میں رہتے تھے۔12000 سال قبل تک آج کے بلوچستان کی سرزمین سرسبز ،زرخیز اور مختلف انواع کے جانوروں سے بھری ہوتی تھی، اس دور کو تر زمانہ کہاجا سکتا تھا کیونکہ بارشیں بہت زیادہ ہوتی تھیں، غاروں کے تراشے ہوئے پتھروں کی موجودگی دوسرے شواہد کے ساتھ یہ بیان کرتی ہے کہ بلوچستان میں غاروں کے باسی رہا کرتے تھے۔

عظیم درّہ بولان کے دہانے واقع مہر گڑھ زمانہ قدیم میں موجودہ افغانستان وسطی ایشیا، اور فارس کے ذریعے عراق کے درمیان تجارتی تبادلے کے نشانات کی گواہی دیتے ہیں۔ محققین لکھتے ہیں کہ مشرق سے وادی سندھ کے تاجروں کے قافلے خشکی کی راہ سے جنوب مغربی بلوچستان آکر اپنا سامان فروخت کرتے تھے، مکرانی تاجر اس سامان کے ساتھ کچھ اپنا مخصوص سامان تجارت لے کر خلیج فارس کو کشتیوں سے عبور کر کے سمیریا تک پہنچتے تھے۔ یہاں سے خرید و فروخت کر کے دیالہ کارخ کرتے تھے جو بغداد کے پاس واقع تھا۔ دیالہ سے وہ مری چلے جاتے تھے جو شام کے سرحد پر

تھااور پھر اسی راہ سے مکران واپس آجاتے !...ماریؔ یا مریؔ۔ دیالہ اور اُر کے علاوہ ہجوان کی تجارت کے خاص خاص مراکز تھے۔ غالباً یہ لوگ اپنا سامان عیلام کے پایہ تخت منوش کے بازار میں بھی پہنچاتے تھے۔ ان قدیم مکرانی تاجروں کی نظر میں سوپطامیہ یعنی وادی عراق کو جو اہمیت حاصل تھی۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ سیمیریا میں ان کی ایک مختصر چھوٹی سی مستقل نو آبادی تھی۔

مہر گڑھ سے ملی ہوئی قبریں یہ نشاندہی کرتی ہیں کہ مردوں کو اکڑوں دفن کیا جاتا تھا۔ بچوں کو علیحدہ دفنایا جاتا تھا اور بالغوں کے ساتھ اکٹھے دفن نہیں کیا جاتا تھا۔ تمام قبروں سے برتن ملے اور ساتھ ہی بہترین فنی نمونے کے موتیوں والے زیورات بھی قبروں سے ملے ہیں جو کہ مکران کے ساحل کے مچھیروں سے تعلق کو ظاہر کرتا تھا۔ مشرقی بلوچستان (یعنی پاکستانی بلوچستان) مغربی بلوچستان (یعنی ایرانی پاکستان) اور شمالی بلوچستان (یعنی افغانستان کا بلوچستان) میں انگنت تمدنی آثار ہیں۔ ان مقامات میں سے دریافت آثار قدیمہ سے برآمد شواہد اس خطے کی قدیم تہذیب کی تاریخ کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

ماہرین کی آراء، تحقیق اور ثقافتی نشانات واضح کرتے ہیں کہ بلوچستان تہذیبوں کا گھوارہ ہے، مہر گڑھ جسے جنوبی ایشیاء کے تہذیبوں کا امام اور دنیا کے جدید اور منظم تمدن کا موجد شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بار کھان، نوشہرہ، پیرک، پیریانو غنڈی، رانا غنڈی، مغل غنڈی، ڈابر کوٹ، توغو قلات، سوراب، سیاہ دمب، انجیرہ، کلی گل محمد، نال، کیچی بیگ، دمب سادات، مولہ، ولیپٹ، ستگیں ڈھور، نوشکی، مکران وغیرہ میں تہذیبی نقوش

اور بلوچستان مختلف علاقوں میں قلعے اور ان کے آثار ثبوت فراہم کرتے ہیں یہ علاقہ قدیم تہذیب و تمدن کا مرکز ہے۔ اس کے علاوہ بار کھان سے ڈائنو سارز وو ہیل مچھلی، ڈیرہ بگٹی سے بلوچی تھریم اور بگٹی لیمور کے رکاز (Fossils) ے دریافت کے بعد ماہرین کہتے ہیں کہ بلوچستان کی سرزمین نہ صرف انسانی تہذیب کا امام ہے بلکہ یہ خطہ حیوانات کے افزائش نسل کا بھی بنیادی مرکز ہے۔

بلوچستان کے تہذیبی نقوش کو بلوچ قوم کے سماجی، معاشی اور ثقافتی خدوخال سے موازنہ کرتے ہوئے ماہر آثار قدیمہ جمیل حسین بلوچ لکھتے ہیں:

> ”بلوچستان کی تہذیب و ثقافت خود بلوچوں کے ماخذ کے بارے میں چیخ چیخ کر بولتے دکھائی دیتے ہیں ان ثقافتی و تمدنی دریافتوں سے بلوچ ثقافت کی قدامت عیاں ہوتی ہے، جو ثابت کرتی ہے بلوچ اس دھرتی کے قدیم باشندے ہیں اور ہزارہا سال سے یہاں پر آباد ہیں اور اس تمدن کے وارث ہیں“۔(8)

حوالہ جات:

1۔سید حاکم علی شاہ وغیرہ۔2013۔ بلوچستان جے قدیم آثارن جی ڈائریکٹوری، سندھی لینگوئج اتھارٹی۔حیدر آباد

2۔ڈاکٹر مبارک علی۔2008۔ تہذیب کی کہانی،پتھر کا زمانہ،سانجھ پبلیکشنز،لاہور

3۔ سنگی۔ 2009۔ بلوچستان، تنازعات و محرکات، سنگی ڈویلپمنٹ فاؤنڈیشن،اسلام آباد

4۔ڈاکٹر انجم رحمانی۔1998۔پنجاب، تمدنی ومعاشرتی جائزہ،زاہد بشیر پرنٹرز لاہور

5۔فاروق بلوچ۔2012۔بلوچستان کے تہذیبی نقوش، فکشن ہاؤس لاہور

6۔ش ضحی۔1975۔ہمارا بلوچستان،بولان بک کارپوریشن کوئٹہ

7۔میاں آصف خورشید۔2010۔ مجسموں کی دنیا، فکشن ہاؤس لاہور

8۔ جمیل حسین بلوچ وغیرہ۔2013۔دی کلچرل لیجیسی آف بلوچ سولائیزیشن،بلوچستان

رویو،والیمxxviii نمبر1۔2013۔ مرکز مطالعہ بلوچستان، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

بلوچ جغرافیہ اور مورخین

قدرت کے بیش بہا خزانوں، سونا اگلتی زمین، لہلاتی کھیتوں، پانی کی بوند کو ترستی بنجر اراضی، چٹیل میدانوں، وجاہت پوش پہاڑوں، دلکش وادیوں، خوبصورت وسیع و عریض ساحل، دل موہ لینے والے مناظر، تہذیب و تمدن کے قدیم ترین اثاثہ جات، نقطہ انجماد سے گرتی ہوئی موسم، ایشیا کی گرم ترین پٹی، یخ بستہ ہواؤں، جھلساتی لُو، مہر و محبت کے داستانوں رزمیہ کہانیوں کا وطن بلوچستان قدرت کے حسین امتزاج کی مالک سر زمین ہے۔ اس دھرتی کی کوکھ سے تاریخ کے افق پر جگمگاتے ہوئے ستاروں تلواروں کی نوک پر رقص کرتے بہادروں، ہمسایہ و کمزور طبقات کو تحفظ دینے والے جوانمردوں، قول و اقرار کے پاسبانوں ، قومی جذبے سے بھرپور نوجوانوں، مہر و محبت کے علمبرداروں، امن و آشتی کے پیغامبروں، وفاو ایثار کے جذبے سے سرشار عاشقوں، شیریں گفتار شاعروں، خوش الحان گوّیوں اور قلم کی نوک سے چنگاریاں پیدا کرنے والے سخن وروں نے جنم لیا ہے۔

یہ سرزمین بلند و بالا پہاڑوں و نشیبی کوہستانوں، وسیع و عریض میدانوں، لق ودق صحراؤں پر مشتمل ایسا خطہ ہے جو ارضی و موسمی لحاظ سے مختلف النوع ہے۔ اگر وسطی و مشرقی علاقہ بلند و بالا پہاڑوں پر مشتمل ہے تو انتہائی مشرق و مغرب و جنوب میں نشیبی پہاڑی سلسلے پائے جاتے ہیں۔ انگریز مورخ اے ڈبلیو ہیوز لکھتے ہیں۔

" ایشیا کے وسیع تر براعظم میں بلوچستان (یا بلوچ قبیلے کا ملک) جیسا شاید کوئی اور علاقہ ہو جس کے عمومی جغرافیہ کے متعلق ابھی حال تک بھی لوگوں کی معلومات اتنی محدود مختصر ہوں اس سے کہیں زیادہ اور غالباً صحیح معلومات تو ہمیں اس بیکراں علاقے کے متعلق حاصل ہیں۔ جسے مبہم طور پر وسط ایشیا کہا جاتا ہے۔ جو خوفناک صحراؤں اور زرخیز نخلستانوں کی سرزمین ہے جو تیس چالیس سال پہلے جغرافیہ نگاروں کے لئے واقعی ایک نیا میدان تھا لیکن پھر روس کے فتح کی آہستہ مگر مصمم پیشرفت نے اسے سائنسی تحقیق و تدوین کے لئے قابل رسائی بنا دیا۔ اندرون عرب کے متعلق جغرافیہ دان اتنا ہی کم جانتے ہیں۔ جتنا کہ استوائی افریقہ کے متعلق قریب قریب یہی حال بلوچستان کا ہے"۔(1)

بلوچستان اور بلوچوں کے قدیم مسکن کے حدود اربعہ اور جغرافیہ کے بارے میں ہمارے مورخین و محققین، جغرافیہ دانوں، سیاحوں اور لکھاریوں نے اپنے اپنے نگارشات میں اپنے اپنے انداز و معلومات کے مطابق روشنی ڈالی ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ حوالہ جات کو پیش کر کے قارئین کو مفید معلومات فراہم کرتے ہوئے اس بحث کو سمیٹنے کی کوشش کریں گے۔

بلوچستان کے تاریخ کے ابتدائی ملکی مورخین میں سے نامور محقق ملک محمد سعید دہوار بلوچستان کے طبعی جغرافیہ کو یوں بیان کرتے ہیں۔

” بلوچستان کی سرزمین اپنی آب ہوا کی شدت، رقبے کی وسعت، مسافتوں کی طوالت، آبادی کی قلت، محدود وسائل آبپاشی، قابل کاشت اراضیات کی کمی، معدنیات کی فراوانی، سرسبز وادیوں، بے آب وگیاہ لق و دق میدانوں، جنگلات و سبزے سے عاری گھٹے ہوئے پہاڑی سلسلوں، دشوار گزار درّوں، نسلی اختلافات اور زبان کی تنوع کی وجہ سے اس کرّہ ارض پر عجوبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔“(2)

موجودہ دور میں بلوچی زبان بولنے والوں اور بلوچ نسل سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے بارے میں ڈاکٹر واحد بخش بزدار لکھتے ہیں۔

”جغرافیائی تقسیم کے اعتبار سے پاکستا ن کے علاوہ ایران، افغانستان، خلیج فارس اور جنوبی افریقہ کے علاقوں میں آباد ہیں۔پاکستانی صوبہ بلوچستان کا کل رقبہ 1,43,200 مربع میل ہے یہ رقبہ کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ ہے۔ صوبے کی سب سے بڑی آبادی ان بلوچ قبائل پر مشتمل ہے۔ جو بلوچی زبان بولتے ہیں۔ ماسوائے خالص پشتون علاقوں کے یہ زبان ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ایران کا موجودہ صوبہ سیستان (ماضی میں ایرانی بلوچستان کہلاتا تھا) کی غالب آبادی بلوچ قبائل پر مشتمل ہے اور بلوچی ان کی مادری زبان ہے۔ افغانستان میں ہلمند

کا ایک حصہ فراح، چکنور اور گرم سیل کے علاوہ شوراوک اور
ہرات میں بادغین تک قدیم عہد سے بلوچ آباد ہیں اور بلوچی
بولتے ہیں۔ترکمانستان کے علاقہ 'ماری" میں کم وبیش پچاس ہزار
بلوچ آباد ہیں اور بلوچی بولتے ہیں۔ اسی طرح تنزانیہ، یوگنڈااور
کینیا میں بلوچ بستیاں آباد ہیں۔(3)"

بلوچستان کے نامور ناول نگار، ادیب، دانشور اور مورخ آغا گل بلوچستان کے جغرافیہ کا احاطہ یوں کرتے ہیں۔

"بلوچستان کا رقبہ میر نصیر خان نوری، خان قلات (1750-1795) کے عہد حکومت میں چھ لاکھ مربع کلومیٹر سے زائد تھا۔ بلوچستان مغربی سمت میں بمپور اور جاسک، شمال میں شال (کوئٹہ) شمال مشرق میں ڈیرہ غازی خان، داجل اور ہڑند جبکہ مشرق میں سندھ کی سرحد تک پھیلا ہوا تھا۔ جنوب میں لسبیلہ اور کیچ شامل تھے۔اس نے کلاچی کُن (کراچی) کی منافع بخش بندر گاہ کو کلہوڑوں سے چھین کر بلوچستان میں شامل کر لیا۔ پادری ولیم کیری بلوچستان کی ریاست کو ابھرتے ہوئے ریاست کے طور پر دیکھتے تھے۔ان کے خیال میں بلوچستان علاقائی سیاست میں اہم کردار ادا کرنے کے قابل تھا۔ لہٰذا انہوں نے بائبل کا بلوچی ترجمہ ضروری سمجھا

تھا تا کہ ریاست بلوچستان میں پڑھے لکھے افراد اپنی مادری
زبان میں بائبل سے مستفید ہو سکیں"۔

وہ اس بارے میں مزید لکھتے ہیں۔

" ہمسایہ ممالک نے بلوچوں کے مختلف علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ ازاں بعد بلوچوں کی گرفت کمزور پڑی تو افغانستان نے ساٹھ ہزار کلو مربع کلومیٹر پر قبضہ کرلیا۔ تفصیل کے مطابق افغانستان نے مندرجہ ذیل بلوچ علاقوں پر قبضہ کرلیا۔

☆ ہلمند... جہاں بلوچوں کی 75 فیصد آبادی ہے جس میں نوشکے اور دالبندین کے شمالی علاقے ہے۔

☆ نمروز... جہاں بلوچوں کی آبادی 80 فیصد ہے۔

☆ فراح ... یہاں بھی 90 فیصد آبادی بلوچوں پر مشتمل ہے۔ حتیٰ کہ نصف نورزئی قبیلہ اب تک بلوچی بولتا ہے۔

ایران نے بلوچوں کے مندرجہ ذیل علاقوں پر قبضہ کرلیا۔

سیستان و بلوچستان ... جہاں بلوچ تقریباً 90 فیصد ہے۔ یہاں زبان کُردی و فارسی رائج ہے۔ پاکستان کے بلوچ سنی العقیدہ ہیں جبکہ ایران میں شیعہ بلوچ بھی پائے جاتے ہیں ایران نے بلوچوں کے تقریباً پونے تین لاکھ مربع کلومیٹر پر قبضہ کرلیا۔ جبکہ اس وقت کے حکمرانوں نے 1960ء کی دہائی میں بلوچستان کا ایک حصہ ایران کو فروخت کردیا تھا(4) ۔"

جبکہ لارڈ کرزن بلوچ علاقوں کا جغرافیہ یوں رقمطراز کرتے ہیں۔

"یہ علاقہ ہلمند اور بحیرہ عرب (ساحل مکران) اور سندھ کے درمیان واقع ہے۔ افغانستان میں ہلمند کا ایک حصہ، فراح، چکنسور اور گرم سیل کے علاوہ شوراوک اور ہرات تک بلوچ علاقہ ہے"

محمد سردار خان بلوچ اپنے اجداد کی سرزمین کا جغرافیہ یوں رقمطراز کرتے ہیں۔

"اگر ایک لائین روس کی سرحد سرخس سے گنمبد مشہد اور پھر سیدھی بمپور اور پھر بندر عباس تک کھینچی جائے تو اس لائین کے مشرق میں افغانستان اور ایران کی حدود کو چھوتا ہوا تمام علاقہ بلوچ علاقہ ہے اور اس کا کل رقبہ 3,40,000 مربع میل ہے" (5)

جسٹس میر خدا بخش مری اپنے کتاب میں اس بارے میں اظہار خیال یوں کرتے ہیں۔

"اگر ہم بحیرہ عرب میں بندر عباس سے شمال میں کرمان کی طرف ایک لائین کھینچیں اور شمال میں ایران کے علاقہ نہہ کی طرف بڑھیں اور افغانی سیستان میں فراح کے مشرق میں آئیں اور اس کے مشرق میں گریشک تک بڑھیں اور وہاں سے پاکستان میں بلوچستان کے مدیر باران خان کے گاؤں تک آئیں بعدازاں

بلوچستان کے شمالی علاقہ میں سے ہوتے ہوئے۔ مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خان کے ضلعوں تک بڑھیں اور پھر وہاں سے اس جیکب آباد ،لاڑکانہ کی جنوب مشرقی سرحد سکھر اور دادو کے شمال تک آئیں اس کے بعد مغرب کو مڑیں اور بحیرہ عرب میں کراچی کے قریب بلوچستان کے ضلع لسبیلہ کی سرحد تک پہنچ جائیں یہ مذکورہ علاقہ بلوچستان کی حدود ہوں گی اور اس کا رقبہ 2,50,000 مربع میل ہو گا۔"(6)

ڈاکٹر عنایت اللہ بلوچ اپنی تحریر میں یوں بیان کرتے ہیں:

" بلوچ پاکستان، ایران اور افغانستان میں آباد ہیں۔ بلوچ خطہ اور آبادی تین ہمسایوں میں منقسم ہے۔ ایران میں مند سے کرمان تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جبکہ نیچے کی جانب 400 میل طویل ساحل سمندر جو بندر عباس سے جیونی تک ہے اسی حصے میں ہیں اور جیونی سے کراچی تک تقریباً 350 میل وہاں سے زابل تک سارا علاقہ بلوچ علاقہ ہے"۔(7)

سلیم خان گمّی بلوچستان کے حدود کو یوں بیان کرتے ہیں:۔

"بلوچستان کے حدود صحیح طور پر متعین نہیں ہیں عام طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس کا محل وقوع کے ایرانی سطح مرتفع کا جنوب مشرقی حصہ ہے جو مشرق میں دشت کرمان اور کوہستان باشگرد

سے سندھ اور پنجاب کے جنوبی حدود تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ خشک
اور کوہستانی ملک جس کے باشندے زیادہ تر خانہ بدوش ہیں۔
پاکستان اور ایران کے درمیان بٹا ہوا ہے ۔ آج کل کچھ بلوچ
سندھ اور پنجاب نیز سیستان میں کچھ خانہ بدوش روس ''مرو'' کے
قریب ملتے ہیں۔" (8)

مولانا ابو الکلام آزاد ذوالقرنین کی مشرق کی جانب پیش قدمی کے متعلق یوں خیال آرائی کی ہے۔

''یہ خانہ بدوش قبائل کون تھے ؟ان مورخین کی صراحت کے مطابق بیکٹریا (Becteria)یعنی بلخ کے علاقہ کے قبائل تھے۔نقشے پر اگر ڈالو گے تو صاف صاف نظر آئے گا کہ بکٹریا ٹھیک ایران کے لئے مشرق اقصیٰ کا حکم رکھتا ہے کیونکہ اس کے آگے پہاڑ ہیں اور انہوں نے راہ روک دی ہے۔اس کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ گدروشیا کے وحشی قبیلوں نے اس کی مشرقی سرحد میں بدامنی پھیلائی تھی اور ان کی گوشمالی کے لئے اسے نکلنا پڑا۔ گدروشیا سے مقصود وہی علاقہ ہے جو آج کل مکران کہلاتا ہے "

میر گل خان نصیر مسٹر ڈیمز و دیگر کے حوالے یوں لکھتے ہیں:

''اس سے یہ رائے معلوم ہوتی ہے کہ کسی زمانے میں کوچ و بلوچ
بحر کیسپئن کے ساحلی علاقوں میں آباد رہے ہیں۔ جہاں بحر
کیسپئین یعنی ایران کی شمالی سمت میں کوچ و بلوچ کے کسی زمانے

میں آباد ہونے کا تعلق ہے۔ اس سے ہمیں انکار نہیں کیونکہ
سرپرہ کے متعلق جو ایک براہوئی یا دوسرے لفظوں میں کوچ
قبیلہ ہے۔ مسٹر سٹریبو (Strabo) بھی یہی لکھتا ہے وہ ایک
ایسے قبیلہ کے ہمسائے تھے جو کرد کے نام سے مشہور تھا۔ سرپرہ
ان کے اور بحر کیسپئین کے درمیان آباد تھے"۔(9)

مظہر علی خان لاشاری مختلف مورخین کے حوالوں کے بعد بلوچ جغرافیہ کو یوں لکھتا ہے۔

" بلوچ کرمان میں چوتھی صدی ہجری میں سکونت اختیار کئے ہوئے تھے اور تین سو سال پہلے عربوں نے اس علاقہ پر قبضہ کیا تھا تو یہ لوگ اس وقت بھی یہیں آباد تھے۔ بلوچ کوچوں کے علاقے کے قریب آباد تھے۔ آگے بیان کرتے ہیں کہ کرمان کے شمالی سرحد مکران ہے اور مکران کے درمیان جو صحرا ہے وہ بلوشوں (بلوچوں) کی جانب جاتا ہے لیکن آگے چل کر پھر بیان کرتے ہیں کہ بلوچ قونشی کے پہاڑوں کے مرتفع علاقے میں رہتے ہیں اور ان کے سوا کوئی ان پہاڑوں میں داخل نہیں ہو سکتا وہ بدوؤں کی طرح مویشی پالتے ہیں اور خیموں میں رہتے ہیں۔ نیز ان کے علاقے سے گزرنے والے راستے محفوظ ہیں"۔ اصطغری نے بھی سجستان کے ذکر کرتے ہوئے اس ملک کے صوبوں کی فہرست پیش کی ہے جن میں سے دو (نمبر شمار 19 اور 22) کو بلوچ (بلوچوں) کا ملک کہا ہے جس صحرا میں بلوچوں کو آباد دکھایا گیا در حقیقت وہ

کرمان کے سلسلہ ہائے کوہ کے جنوب میں واقع نہیں۔ معلوم ہوتا ہے بلکہ وہ عظیم صحرا ہے جسے اب دشت لوطِ کہا جاتا ہے اور جو کرمان کے شمال اور مشرق میں ہے اور کرمان اور خراسان کوہستان سے علیحدہ کرتا ہے۔ اسی طرح ادریسی جو ایک محتاط مورخ تھا لکھتا ہے کہ سلسلہ ہائے کوہ کوچ میں وحشی نسل لوگ آباد ہیں ایک قسم کے کرد اور بلوچوں کی آبادیاں ہیں کچھ تو شمال کی جانب اور کچھ مغرب کی جانب ہیں۔ "

اے ڈبلیو ہیوز قلاتی بلوچستان کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

"بلوچستان اپنے موجودہ طول و عرض میں اس علاقہ پر مشتمل سمجھا جاتا ہے۔ جس کی شمالی اور شمال مشرقی سرحد پر افغانستان کی وسیع سلطنت ہے۔ مشرقی سرحد پر برطانوی سرحد صوبہ سندھ سے متعین ہوتی ہے۔ مغربی سرحد پر سلطنت ایران ہے اور جنوب میں بحیرہ عرب قریباً چھ سو میل تک اس کی پابوسی کرتا ہے"۔(10)

سابق خان آف قلات، میر احمد یار خان موجودہ پاکستانی بلوچستان کے حدود و اربع کو یوں بیان کرتے ہیں۔

" پاکستان کا جنوب مغربی صوبہ بلوچستان مشرق میں سندھ، جنوب سے بحیرہ عرب، شمال مشرق میں پنجاب سے اور شمال میں افغانستان اور وفاق کے ماتحت قبائلی علاقوں سے ملا ہوا

ہے۔ اس کے شمال میں چاغی، پشین اور ژوب کے اضلاع
کے ساتھ ایک ہزار ایک سو اٹھتر کلومیٹر طویل سرحد کے
ساتھ واقع ہیں۔ اس طرح مغرب میں مکران ڈویژن ہے۔
ضلع خاران، اور چاغی کا مشرقی حصہ مل کر ایران سے ملی ہوئی
آٹھ سو اڑتیس کلومیٹر طویل سرحد تشکیل دیتے ہیں۔
جنوب میں چھ میل لمبی ساحلی پٹی واقع ہے۔ جس پر آٹھ
بڑی اور چھوٹی بندر گاہیں یعنی گوادر، پسنی اور ماڑہ، سونمیانی،
گڈانی بحیرہ عرب اور خلیج فارس واقع ہیں۔ (11)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ بلوچستان عہد قدیم میں دو انتظامی ریاستوں میں منقسم تھا۔ ایک ریاست کیکان کے نام سے شمالی اضلاع پر مشتمل تھی جس کا مرکزی مقام دمب سادات کی بستی کو قرار دیا جاتا ہے دوسری ریاست جنوبی علاقوں جھالاوان، مکران اور لسبیلہ پر مشتمل تھی۔ اس کا صدر مقام نال کے قریب سور دمب تھا۔(12)

ڈاکٹر عبد الرحمن براہوئی بلوچستان کے محل وقوع کو یوں زیر قلم لاتے ہیں۔

" بلوچستان کے شمال میں افغانستان و صوبہ سرحد، جنوب میں
بحیرہ عرب، مشرق میں سندھ و پنجاب اور مغرب میں ایران
واقع ہیں۔ یہ مشرق وسطیٰ، وسطی ایشیا اور بحیرہ ہند سے قریب
ہے۔ یونانی، عرب، ایرانی، منگول فوجیں یہاں آئی ہیں۔ اس
لئے اسے تاریخی اور فوجی اہمیت حاصل ہے۔ مغرب میں اس کا

520 میل (832 کلو میٹر) طویل سرحد ایران کے ساتھ اور
720 میل (1120 کلو میٹر) افغانستان کے ساتھ ملا ہوا ہے
بلوچستان کا رقبہ 1,34,002 میل(214480 کلو میٹر) بقول
بعض 1,34,050, مربع میل ہے جو سندھ، پنجاب اور بہاولپور
سے زیادہ ہے اور فرانس کے برابر ہے"۔(13)

ڈاکٹر حمید بلوچ جنہوں نے بلوچ، افغان اور فارس کے سرحدات پر کتاب لکھ کر گراں قدر خدمت سر انجام دیا ہے۔ انہوں نے مکران کے جغرافیہ پر نامور مورخین کے حوالہ جات کے ساتھ تفصیلی بیان قلمبند کیا ہے۔

" بلوچستان اور اس کے قرب وجوار کے سرحدی علاقوں کے حوالے اہم ماخذ ابن حوقل کی کتاب "مسالک وممالک" ہے جس میں مکران اور کرمان کے علاقوں کی تفصیل موجود ہے۔"شاہنامہ فروسی" کے مطابق ساسانی بادشاہ بہرام چہارم(420-438-AD)نے ایران اور توران کے درمیان بنیادیں کھڑی کرکے ان ممالک کے مابین سرحدوں کی تعین کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے آمو دریا کو ایران (فارس) کا شمال مشرقی سرحد تصور کیا۔ ابن حوقل کے مطابق صوبہ کرمان کے مشرق میں مکران اور یگستان اور بحرین (دو سمندر) اور اس کے سرحد پر بلوچ(Bolouje) آبادہیں۔ کرمان کے مغرب میں پارس (Pars)واقع ہے۔ خراسان اور سجستان(سیستان) شمال میں

جبکہ پر شین سمندر اور سیر کان (Seirgan) جنوب میں واقع ہے
کرمان کے موسم کے حوالے سے ابن حوقل لکھتے ہیں کہ اس خطے کا
موسم سرد اور گرم کا امتزاج رکھتا ہے۔ یہاں پر گرم علاقوں کے تمام
پھلوں کے تقسام پائے جاتے ہیں۔اس کے ساحلی علاقے ہر
موز (Harmuz)اور جرون (Jaron) گرم علاقے ہیں۔

سیر کان (Sirgan) اور یگستان کے درمیان یزد (Yezd) کے علاقے جردہ (Jerdeh)،زرند(Zerand)، فردین(Ferdin)،ماہان(Mahan)اور خبیص (Khabis)واقع ہیں۔ جبکہ بم (Bam) کے قریب برماسیر (Bermasir)ریگستانی علاقے ہیں۔ ریگستان کے درمیانی علاقے مہرج (Mehreje)، سنج (Sinje)ہیں۔
کرمان کا سرحدی علاقہ خواس (Khous)کے متعلق ابن حوقل لکھتے ہیں کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے سجستان (Sajestan) کا حصہ ہے۔

کرمان کے پہاڑوں کے بارے میں ابن حوقل لکھتے ہیں۔ قفص (Kefes) کے سلسلہ ہائے کوہ سمندر کے کنارے جنوب میں واقع ہیں۔ جیرفت(Jireft)کے سرحد کے قریب روداں (Rudan)اور کوہستانی علاقہ ابوغانیم (Abughanuem) واقع ہیں۔
جبکہ مشرق میں خواس اور ریگستانی علاقہ ہے۔ جو قفص اور مکران کے صوبے تک پھیلا ہوا ہے۔ جبکہ جنوب میں بلوچ (Balouje or Baloch) اور میر جان (mirjan)کا سرحدی علاقہ ہے

ہرموز(Harmoz)کے قریب پہاڑی علاقوں میں زرخیز زمین پائی جاتی ہے جہاں

مختلف اقسام کے اجناس اُگائے جاتے ہیں۔ اس کے گلہ بانی زور شور سے کی جاتی ہے۔ کرمان کے پہاڑی علاقوں میں مختلف سرداروں (Chiefs) کی حکمرانی ہے جو داخلی طور پر خود مختار ہیں۔ انہیں سلطان کی جانب سے شرط امن و امان اور تابعداری کے عوض شاہرہ بھی دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ کرمان، فارس اور سجستان کے شاہراہوں کو لوٹتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کے متعلق ابن حوقل لکھتے ہیں کہ زیادہ تر پیدل سفر کرتے ہیں اور یہ عرب نژاد ہیں اور لوٹ مار کے ذریعے کافی دولت مند بھی ہیں۔ ان سرکش اور بہادر لوگوں کو ابن حوقل دو گروہوں میں منقسم کرتے ہیں۔ بلوچ (بلوچ) جو کہ کوہ قفص کے صحرا نشین ہیں۔ قفص جنہیں فارسی زبان میں کوج (Kouje) کہا جاتا ہے۔ انہیں مشترکہ طور پر کوچ و بلوچ کہتے ہیں۔ بلوچ صحرا نشین ہیں اور کسی کو خاطر میں لائے بغیر لوگوں کو لوٹتے رہتے ہیں۔

کوہ ماران (Maren) کرمان کا سرد علاقہ ہے جو کہ کافی زرخیز اور قدرتی وسیلوں سے مالامال ہے لیکن کرمان کا زیادہ تر علاقہ گرم خطوں پر مشتمل ہے۔ گرم علاقہ ہر مزے مکران تک کے علاقوں پر مشتمل ہے۔ کرمان کے لوگوں کی زبان فارسی ہے۔ لیکن کوچ اور بلوچ ایک مختلف زبان استعمال کرتے ہیں۔ خواس (Khaus) کے باسی صحرا نشین ہیں ان کا گذارہ شتربانی اور کھجوروں کے باغات پر ہیں۔

مکران و توران ہندوسندھ کے جنوب میں بحیرہ فارس میں واقع ہے۔ مکران و توران کے مغرب میں کرمان اور سجستان کے صحرا واقع ہیں۔ بلوچ آبادی والے علاقے بشمول مکران اور کرمان کے جنوب میں واقع ہیں۔ ابن حوقل کے مطابق مکران،

ملتان منصورہ(سندھ)اور توران کے درمیان ندہ (Nedeh)واقع ہے۔اس سلسلے میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ یہ علاقہ دریامہران سندھ کے مغرب میں واقع ہے۔اس علاقے کا اہم شہر قندابیل(Kandabil) ہے جو تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے مشہور ہے۔اس علاقے کے باسیوں اور صحرانشینوں(بلوچوں)میں مماثلت پائی جاتی ہے۔توران ایک چھوٹا سا علاقہ ہے جو کہ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں پر مشتمل ہے۔ احمد بن معمر اس علاقے کا سربراہ ہے۔وہ خلیفہ اسلام کا خطبہ پڑھتا ہے۔توران کا پایہ تخت جہاں احمد بن معمر (Ahmed ben Maumr)رہائش پذیر ہے۔کافی ترقی یافتہ ہے۔اور اشیاء خورد نوش اور پھلوں سے مالامال ہے۔موسم معتدل ہے۔

مکران ایک وسیع و عریض علاقہ ہے۔ لیکن پانی اور اشیاء خورد و نوش کی نایابی بدرجہ اتم موجود ہے۔ حسین بن عیسیٰ بن معدان یہاں کا حاکم ہے۔ جنہوں نے علاقہ مہرا (Mihara)کو زیر کرکے اس پر قبضہ کرلیا تھا۔اور اس کے اہم شہر کیز(کیچ) میں رہائش پذیر ہوگئے۔ کیچ کے متعلق ابن حوقل لکھتے ہیں کہ یہ ملتان جتنا بڑا شہر ہے اور اس کے ساحلی علاقے میں ایک قابل استعمال بندرگاہ موجود ہے۔یہاں پر بہت سارے کجھور کے باغات پائے جاتے ہیں۔ابن حوقل کے مندرجہ بالا تذکرہ سے یہ بات عیاں ہے کہ کرمان اور مکران بلوچوں کے علاقے تھے۔ اور ان کی مذکورہ علاقوں میں موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ زمانہ قدیم سے کرمان اور اس کے قرب وجوار کے علاقے بلوچستان سے تعلق رکھتے تھے"۔(14)

کامران اعظم سوہدروی پاکستانی اور ایرانی بلوچستان اور افغانستان میں آباد بلوچوں کے جغرافیہ کو بھی تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کرکے بہت سے علاقوں کے متعلق اظہار کرتے ہیں۔

''ایران کے بلوچ اور بروہی قبائل کی اکثریت جنوب مشرقی ایران میں صوبہ سیستان و بلوچستان آباد ہے۔ لیکن بعض مورخین تاریخی اور معاشرتی عوامل کے تحت وہ دوسرے صوبوں میں بھی آباد ہیں۔ اس لئے ان کی صوبہ جات میں آبادکاری کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

صوبہ کرمان :۔ صوبہ کرمان بلوچوں کی قدیم ترین رہائش گاہ ہے جہاں وہ سلجوق ترکوں کی ایران میں عملداری سے سو سال پہلے تک نقل مکانی کرتے ہوئے پہنچ چکے تھے اور سلجوقیوں کے ایران میں دور حکومت کے بعد وہ کرمان سے نقل مکانی کرتے ہوئے ایرانی بلوچستان میں آباد ہوگئے تھے لیکن تاحال صوبہ کرمان میں بلوچ کافی تعداد میں رہتے ہیں۔ جن کی تفصیل یوں ہیں۔ سرابندی قبیلہ (علاقہ بم) ہوت قبیلہ (کہن علی علاقہ، جنوب مشرقی کہنوج نزد جھیل جازموربان) طاہر قبیلہ (علاقہ ہرمزگان وغیرہ)

صوبہ خراسان :۔ صوبہ خراسان ایران کا سرحدی صوبہ ہے۔ جس کے مشرق میں افغانستان اور شمال میں ترکمانستان ہے۔ خراسان کے معروف قبائل یہ ہیں۔ نوتانی، دہ مردہ، براہوئی کچھ دیگر بلوچ شامل ہیں۔

صوبہ سیستان وبلوچستان:۔ ایران کا یہ صوبہ بلوچوں کا گڑھ ہے ہجرت کی وجہ سے بلوچ آبادی کم ہو گئی ہے۔ یہ صوبہ پاکستان، افغانستان، خلیج فارس کے ساتھ واقع ہے۔ باقی اطراف میں خراسان، کرمان، ہرمزگان کے صوبے ہیں۔ اس صوبے کے اہم بلوچ قبائل اوران کے مستقر کی تفصیل یوں ہے۔ ریکی...یہ قبیلہ وہاں کے بلوچوں کا سب سے بڑا قبیلہ شمار ہوتا ہے۔ جو وسیع علاقہ جات زاہدان سے میر جاوا، خاش اور ایرانی شہر میں پھیلا ہوا ہے۔ اس بڑی کی بڑی شاخیں یہ ہیں۔ بولاک زئی، اسماعیل زئی (زاہدان) حسن زئی (زاہدان)، یار محمد زئی (خاش) گمشاد زئی (لاگشت) اور دہانی (سراوان، مولتان) بارک زئی، (بلیدہ، دشتیاری، قصر قند) ہوت (کنارک) رئیس (قصر قند، سرباز، چانف، پیپ) لاشار (بمپور ولاشار) بامری (بمپور، جازموریان جھیل تک) ان معروف قبائل کے علاوہ چھوٹے بڑے بلوچ اور براہوئی قبائل کے ساتھ ساتھ کھوسہ، میر ستیار، جدگال، لیتک، صابر ولگور جیسے دیگر بلوچ قبائل دشتیاری سے سمندر یعنی خلیج فارس او رنجیرہ عرب کے کنارے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ناہروئی نیک شہر، بنت، قنوج اور راس صوبہ کے جنوب مغرب میں رہائش پذیر ہے اور مید گواتر بندرگاہ کے مغرب سے سیریک تک پائے جاتے ہیں۔

افغانستان کے جنوب مغربی صوبوں میں قدیم زمانے سے بلوچ آباد چلے آرہے ہیں۔ صوبہ نیمروز (چخانسور) اور صوبہ ہلمند بلوچ اکثریت کے صوبے ہیں۔ صوبہ قندھار میں بھی بلوچ بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ ان کے علاقوں کے علاوہ افغانستان کے مختلف صوبوں میں موجود ہیں جن میں سے صوبہ جات بادغیس، غور اور میمند میں عید زئی،

کھجبئ ، نوتانی ، کشانی ، گورگیج، صوبہ جات کندوز و بقلان میں نورزئی ، باران زئی(مینگل)صوبہ جات شیر غان و بلخ میں رئیسانی، رخشانی، گورگیج ضلع کشم صوبہ بدخشاں تاوجو زخان فاریاب، فراح و ہرات ، کابل، نیمروز، ہلمند اور ریگستان کے علاقے میں محمد حسنی ، زہروزئی، سرگل زئی ، رخشانی، نوشیروانی، سنجرانی، گورگیج ، میروانی، میشک خانی، قلندرانی، جمالدینی، شاہوانی، پرکانی، ساسولی، میران، بادیزئی وغیرہ قبائل آباد ہیں۔

ترکمانستان میں تکنے علاقے کے مرکز، ارسری علاقے کے جنوب مشرق او ریومنڈ کے مغرب میں آباد ہیں۔ واضح رہے کہ وہاں ”ماری “کا علاقہ ہے جہاں پر بڑی تعداد میں بلوچ آباد ہیں“۔(15)

بلوچ تاریخ کو تاریخ مردوخ اور کردگال نامے کے پس منظر میں ایک نئے رخ اور زاویئے سے لکھنے والے نامور محقق و مورخ آغا نصیر خان احمد زئی کمبرانی لکھتے ہیں۔

> ” وسطی ایشیاء کا جنوبی حصہ جو ساحل سمندر سے متصل ہے اور ایک وسیع و عریض اور مربوط و متصل علاقے پر مشتمل ہے۔ بلوچ قوم کے بود و باش رکھنے کی وجہ سے بلوچستان کے نام سے موسوم ہے۔اس خطے کا کل رقبہ تقریباً 2,43,487 مربع میل ہے۔ زمین کا یہ وسیع اور پیوستہ علاقہ موجودہ وقت میں سیاسی حیثیت سے تین ملک میں بٹا ہوا ہے ۔ ایران ،

افغانستان اور پاکستان۔ ایرانی بلوچستان کا کل رقبہ 69,487 مربع میل، افغانی بلوچستان کا رقبہ 40,000 مربع میل اور پاکستانی بلوچستان کا رقبہ 1,34,000 مربع میل ہے"۔(16)

احمد خان قیصرانی اپنے کتاب میں بلوچستان کی جغرافیائی پس منظر یوں بیان کرتے ہیں۔

" بلوچستان کو رقبے کے لحاظ سے باقی صوبوں پر فوقیت حاصل ہے۔ملک کے کل رقبہ کا ترتالیس فیصد ہے۔ خصوصاً چاغی کے مقام پر کامیاب ایٹمی تجربات کے بعد اس کی تاریخی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ گیس کے سب سے بڑے ذخائر بلوچستان میں ہیں پٹرول نکلنے کے واضح آثار اور امکان موجود ہیں۔ یہ واحد صوبہ ہے جس کی سرحدیں دو ہمسایہ ممالک ایران اور افغانستان سے ملتی ہیں۔ اس کے آب وہوا میں تنوع ہے ایک طرف جنوب میں ساحل سمندر ہے تو دوسری طرف سطح مرتفع کے علاقے ہیں بلوچستان کے اس وقت چھ ڈویژن اور اکیس اضلاع (موجودہ دور میں سات ڈویژن اور تینتیس اضلاع ہو چکے ہیں) نصیر آباد ڈویژن میں جعفر آباد، تمبو (موجودہ نصیر آباد) اور کچھی اضلاع (واضح رہے کچھی ضلع کچھی اور جھل مگسی کے نام سے جبکہ جعفر آباد ضلع جعفر آباد اور صحبت پور کے نام سے

الگ الگ ضلعوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں) یہ ڈویژن خان آف قلات میر نصیر خان نوری کے نام سے منسوب ہے کیونکہ یہاں پر نصیر آباد نام سے کوئی مقام نہیں ہے۔ پہلے نصیر آباد ایک ضلع ہوتا تھا۔ جس میں جیکب آباد بھی شامل تھا۔ پھر اسے بلوچستان کا حصہ بنادیا گیا۔ اسی طرح ضلع لسبیلہ کچھ عرصہ (کراچی (سندھ) کے ساتھ رہا۔ پھر اسے دوبارہ بلوچستان میں شامل کر دیا گیا۔ اس سے پیچھے جائیں تو جیکب آباد بلوچستان کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ اس کا نام "خان گڑھ" تھا کہا جاتا ہے کہ یہ نام بھی خان قلات کی نسبت سے تھا۔ کچھ اور پیچھے جائیں تو معلوم ہو گا کہ کراچی بھی مکران (بلوچستان) کا حصہ رہا ہے ۔ اس کا نام کلانچ تھا جو بتدریج کلاچی، کراچی بعد میں کراچی بن گیا"۔ ایرانی بلوچستان کا پورا علاقہ جہاں بلوچ آباد ہیں مکران کہلاتا ہے یعنی کرمان سے مشرق کی طرف پاکستان بلوچستان کی سرحد تک اور زاہدان سے جنوب کی طرف ساحل سمندر بندر عباس سے مشرقی طرف ، جیونی تک مکران کہلاتا ہے پاکستان اور ایرانی مکران کی 99فیصد آبادی بلوچوں پر مشتمل ہے"۔(17)

معروف مورخ و محقق رحیم داد خان شاہوانی المعروف مولائی شیدائی یوں رقمطراز ہیں۔

" بلوچستان ایشیا کی ماورالنہر ریاستوں جیسے کہ فیوا، بخارہ وغیرہ کی طرح ایک قدیم ریاست ہے موجودہ زمانہ میں جغرافیکل نقطہ ایشیا کے نقشہ میں بلوچستان کا ملک دکھایا گیا ہے۔ اس میں بہت سی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ مثلاً شمال میں وہ علاقے شامل ہیں جن کی آبادی بالعموم افغان ہے جبکہ بلوچستان کا بڑا حصہ مغرب میں ہے اور وہ ایرانی سلطنت کے ماتحت ہے۔ بلوچستان کے شمال میں افغانستان اور شمال مغربی صوبہ سرحد (خیر پختونخوا) مشرق میں سندھ و پنجاب، جنوب میں بحیرہ عرب اور مغرب میں ایران ہے۔ مذکورہ حدود میں مغربی سرحد کا فاصلہ گوادر کی ساحل سے لے کر کوہک تک ہے۔ یہ سرحد 1871ء میں کرنل گولڈ اسمڈ نے مقرر کی۔ اس کے بعد 1896ء میں کوہک سے لے کر ملک سیاہ پہاڑ تک اینگلو ایرانین سرحدی کمیشن نے سرحد کا فیصلہ کیا۔ 1905ء میں دوبارہ اس سرحد کا فیصلہ ہوا۔ شمالی سرحد جو افغانستان سے ملحق ہے۔ اس کا پہلی مرتبہ فیصلہ 1862ء میں بعد ازاں 1894ء میں فیصلہ ہوا"۔(18)

تاج محمد بریسگ اس بات کو وضاحت کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں۔

" گولڈ سمڈ نے 1871ء میں ایک سرحد تشکیل دی جس کو

1896ء میں دوبارہ بڑھایا جس کے ذریعے مغربی بلوچستان
فارس کے حوالے کیا گیا جبکہ بقایا مشرقی حصہ برطانیہ کے
تسلط کے زیر اثر رہا۔ اسی طرح 1894ء میں برطانیہ نے
ڈیورنڈ لائین کھینچی جس کے ذریعہ افغانستان اور بلوچستان کو
تقسیم کیا گیا چند علاقے بلوچستان میں شامل کئے گئے اور بلوچ
علاقے افغانستان کے حوالے ہوئے"(19)

اردن کی بلوچ آبادیوں کے متعلق مولانا نور احمد فریدی لکھتے ہیں۔

" الحاج فیض محمد واڈیلہ لکھتے ہیں کہ اردنی عرب میرے پاس
تشریف لائے ان سے اردنی بلوچوں کے بابت تبادلہ خیال
ہوا فرمایا کہ اردن کی حدود میں بلوچ بکثرت آباد ہیں۔ یہ
لوگ زیادہ تر فوجی ہیں ۔ شجاعت اور غیرت ان میں کوٹ
کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اردن کے بلوچ بہترین گھڑ سوار
ہیں۔ برق رفتاری یں بجواب نہیں رکھتے۔ میں نے زبان کے
بارے میں پوچھا تو فرمایا۔ یہ لوگ ہمارے ساتھ تو عربی
بولتے ہیں۔ لیکن جب آپس میں بات کرتے ہیں تو ایسی زبان
بولتے ہیں جسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اس سے لگتا ہے کہ ان کی
کوئی جداگانہ زبان ہے۔ پھر کہا کہ یہ زبان کردی جیسی ہے۔

اس کے علاوہ بلوچ شہر مر کہ میں آباد تھے جو بڑا شہر ہے ۔اس کے بعد ان میں سے کئی قبیلے حمص اور کئی حلب اور شام کو چلے گئے۔ مزید راوی ہوتے ہیں۔ جمالی قبائل یمن کی درج ذیل بستیوں میں رہتے ہیں۔ ان میں خولان، رعنس، سرلیس، سوادیہ اور رقاش شامل ہیں۔ مولانا نور احمد فریدی مزید بیان کرتے ہیں۔58 ق م تک یہ لوگ کافی اقتدار کے مالک بن چکے تھے۔ ان کی آبادیاں کاکیشیا سے روس ترکستان اور وادی البلوص سے کوہ البرز تک پھیل چکی تھیں۔ ان کا اپنا جھنڈا اور لشکر تھا۔ بڑے بڑے سلاطین ضرورت کے وقت ان سے مدد لیتے تھے۔"(20)

خاتون محققہ ماریہ ملک بلوچستان کے حدود اربعہ کے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

" بلوچستان کا حقیقی حدود اربعہ جہاں پر موجودہ دور میں بلوچ آباد ہیں اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ان حدود کو یوں بیان کرتا ہے شمال مشرق میں دریائے گومل سے آغاز کرتا ہوا جنوب میں بحیرہ عرب تک چلا جاتا ہے۔ مغرب میں ایران اور افغانستان اور شمال مغرب میں کوہ سلیمان اور مشرق میں کھیر تھر پہاڑی سلسلہ ہے۔اس کا ساحل جو مکران کہلاتا ہے۔ایران تک پھیلا ہوا ہے"۔(21)

پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹیڈیز (PIPS) اسلام آباد کے ایک رپورٹ کے مطابق بلوچستان کا جغرافیہ یوں بیان کیا گیا۔

" بلوچستان کا محل وقوع اور طبی خدوخال نہ صرف پاکستان بلکہ دوسرے علاقائی اور بین الاقوامی طاقتوں کے لئے دفاعی اہمیت کے حامل ہیں۔ پاکستانی صوبہ زیادہ تر تاریخی علاقوں پر مشتمل ہے۔ جبکہ مغرب میں ایرانی بلوچستان اور شمال میں افغانستان کے علاقے شامل ہیں۔ جہاں پہ پشتون مرکز کے زیر اہتمام قبائلی علاقہ جات کو چھو کر گزرتا ہے۔ مغرب کی جانب سے بلوچستان کے ساتھ 520 میل لمبی ایرانی سرحد ہے اور شمال میں 720 میل لمبی افغان سرحد ہے۔ مشرق میں پاکستانی سندھ، پنجاب اور صوبہ سرحد (کے پی کے) کے صوبے ہیں۔ ایران کے علاقے سیستان تک یہ سمندر کے ذریعے جڑا ہوا ہے جو کہ خلیج فارس کے منہ پر ختم ہوتا ہے۔ بحیرہ عرب کے 470 میل لمبے ساحل کے ساتھ یہ صوبہ پاکستان کے پورے ساحلی علاقے کے تین چوتھائی حصے پر مشتمل ہے"۔(22)

عنایت اللہ بلوچ اپنی تحقیق کے مطابق اس کا نقشہ یوں ترتیب دیتے ہیں۔

" بلوچستان کی قومی اور نسلی سرحدوں کے متعلق مختلف نکتہ

ہائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مطابق بلوچستان کے صحیح ترین سرحدوں کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ مجموعی طور پر بلوچستان ایرانی سطح مرتفع کے جنوب مشرقی حصے جس کا آغاز بام(Bam) اور بشگیرد(Bashgird) کے مشرق میں صحرائے کمان سے ہوتے ہوئے سندھ وپنجاب کے مغربی سرحدوں پر مشتمل ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق بلوچستان کی سرحدیں شمال میں افغانستان شمال مشرقی بحیرہ عرب اور مغرب و شمال مشرق ایران اور افغانستان کے سرحدوں سے مشرق میں کوہ سلیمان کے پہاڑی سلسلے اور کٹھار کی پہاڑیوں تک ایران کے جنوب مشرقی علاقے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ لارڈ کرزن نے بلوچستان کی تعریف یوں کی ہے۔ ہلمند اور بحیرہ عرب کے علاوہ کرمان اور سندھ کے درمیان پھیلا ہوا ملک۔ اے ڈبلیو ہیوز کے مطابق جدید قابل قبول اصطلاح کے تناظر میں بلوچستان کو عمومی لحاظ سے ایک ایسا ملک کہا جاسکتا ہے۔ جس کے لئے اس کے شمالی اور شمال مشرقی سرحدیں افغانستان کی ایک بہت بڑی سلطنت پر مشتمل ہیں۔ اس کی مشرقی سرحد سندھ کے برطانوی صوبے اور اس کی مغربی سرحدیں ایرانی سلطنت تک محدود ہیں جبکہ بحیرہ عرب

اس کے تقریباً چھ سو میل علاقے پر پھیلا ہوا ہے۔ بہر حال اسے بلوچستان کے متعلق ایک عمومی بیان کہا جاسکتا ہے۔ ڈیمز نے یوں تبصرہ کیا ہے۔ جدید سیاسی سرحدوں سے قطع نظر بلوچستان ایرانی بلوچستان، خانان قلات، ڈیرہ غازی خان کے برطانوی ضلع (ملحق پہاڑی سلسلے کے ساتھ) جیکب آباد اور جہاں تک دریائے سندھ کا تعلق ہے شکار پور کے کچھ حصے پر مشتمل ہے۔ افغانستان کے پشتونوں اور پاکستان کے بلوچوں کے درمیان نسلی سرحدیوں نسلی نہیں بلکہ سیاسی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ نسلی سرحد تھل چوٹالی اور سبی کے حدود سے چمن میں سے گزرتی ہوئی ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں شادون شہر کے نزدیک پٹھانوں اور بلوچوں کے درمیان گزرتی ہے۔ میجر راورٹی نے یہ کہتے ہوئے بلوچستان کے حدودکے ضمن سائرہ البلاد (Saira-ulBaled) کا حوالہ دیا ہے۔ (Kuroh) نمک کے پہاڑی سلسلے کے دامن میں واقع پہاڑ پور سے پھیلی ہوئی اور سمندر کی طرف ڈیرہ جات (Derha- Jat) بھی اسی میں شامل ہے۔ خلاصۃ التواریخ کے مصنف سخن رائے بٹالوی اپنے نقطہ نظر کا یوں اظہار کرتا ہے۔ بلوچستان اور مغل ہندوستان کے درمیان بطور مشرقی سرحد دریائے چناب ہے"۔(23)

اثیر عبدالقادر شاہوانی 1998 کے مردم شماری کو مد نظر رکھتے ہوئے پاکستان میں بلوچی زبان بولنے والوں کے اعداد و شمار اور دیگر رپورٹوں کے مطابق بیرون از بلوچستان تعداد کو یوں بیان کرتے ہیں۔

" پاکستان میں بلوچ بلوچستان کے علاوہ سندھ، پنجاب، خیر پختونخوا اور وفاق کے زیر انتظام علاقوں میں آباد ہیں۔ 1998ء کے مردم شماری کے مطابق بلوچستان میں 42,84,600، صوبہ سندھ میں 2,44,60 صوبہ پنجاب 83,212، خیر پختونخوا (سرحد) میں 1500، وفاق کے زیر اہتمام علاقوں میں 85 اور وفاقی دارالحکومت میں 201 افراد بلوچی زبان بولتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایران میں 18 لاکھ، افغانستان میں 17 لاکھ خلیجی ریاستوں میں 5 لاکھ روس میں 75 ہزار بلوچ بلوچی زبان بولتے ہیں " (24)۔

ڈسٹرکٹ گزٹیئر سیریز جھالاوان میں لکھا گیا ہے۔

" براہوئیوں کے مطابق ہربوئی پہاڑی سلسلہ سطح مرتفع قلات سے کابل تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہربوئی جیسا وجاہتی پہاڑی سلسلہ سطح مرتفع کوئٹہ اور ہندوباغ (موجودہ مسلم باغ) کے راستے کاکڑ خراسان اور غزنی تک پھیلا ہوا ہے "۔ (25)

کرنل راورٹی قندھار کے قدیم نام کو بیلوص لکھے ہیں۔ جی پی ٹیٹ بھی ان کی اس بیان کی تائید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جبکہ ملک الشعرا فارسی بہار اپنے کتاب ''سیستان'' میں لکھتے ہیں قندھار اور اس کے گرد و نواح کا قدیم نام بالوص یا بلوس ہے۔ محمد سردار خان بلوچ بھی ان کی تائید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قرون وسطیٰ کی تاریخ میں صوبہ قندھار مشولہ بہ وسطیٰ مرتفع قلات اور سیستان کے کچھ حصے بیلوس کہلاتے تھے''۔(26)

ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی بلوچ جغرافیہ کو یوں زیر بحث لاتے ہیں۔

'' تاریخی حقائق کے مطابق بلوچ ابتدائی طور پر کوہ البرز آباد ہوئے وہیں سے کرمان کی جانب پھیلے یہ مقام بحیرہ حذر کے قریب واقع ہے۔ قیاس یہی کیا جاتا ہے کہ ان کی ابتدائی آبادی کوہ البرز کے پہاڑی علاقے تھے وہیں سے کرمان پھر سیستان کی جانب پیش قدمی کرتے رہے۔ جہاں وہ آباد ہوئے مورخین کا خیال ہے کہ یہی ان کا بنیادی مسکن ہے ان بحیرہ حذر میں ان کی آبادی قبل از مسیح کے دور میں موجود تھی۔ یہ علاقہ بلوچوں کا بنیادی مسکن کہلاتا ہے۔'' (27)

نصیر دشتی بلوچستان کے جغرافیائی حدود کو یوں بیان کرتے ہیں۔

'' وسیع و عریض خطہ جو جنوب مشرقی ایران سے پنجاب میں دریائے سندھ کے مشرقی دہانے تک۔ افغانستان میں

ہلمند کو چھوتے ہوئے بحیرہ ہند تک پھیلے ہوئے رقبے کو بلوچستان کہا جاتا ہے۔ بلوچوں کے سماجی اور ثقافتی غلبے کی وجہ سے بارہویں صدی میں سلجوقیوں کے دور حکومت میں اس کا نام بلوچستان پڑا سپونر (1983) بلوچستان کے تاریخی اہمیت کے حامل شہروں زرعی علاقوں کو مد نظر رکھتے ہوئے بلوچستان کے حدود کو یوں واضح کرتے ہیں۔ خلیج فارس میں بندر عباس سے کرمان کے ذریعے سیستان میں ہلمند کے دہانے سے قندھار اور سندھ تک پھیلا ہوا ہے"۔(28)

بلوچستان میں تعینات بیسویں صدی کے ابتدائی جغرافیہ کے ایک استاد شمس ضحیٰ بلوچستان جغرافیہ کو یوں بیان کرتے ہیں۔

" دریائے گومل کے جنوب میں ایک عظیم سطح مرتفع ہے۔ ساتھ ہی ساتھ پہاڑوں کا پیچیدہ ایک سلسلہ ہے جو ہر جانب پھیلا ہوا ہے جن کے درمیان سطح سمندر سے 1000 تا 3000 فٹ کی بلندی پر کٹی طاس واقع ہیں۔ان میں سے بعض کی اونچائی 5000 فٹ ہے ایک عام بات یہ ہے کہ یہ سطح مرتفع جنوب مغرب میں بتدریج نیچی ہوکر ایرانی ریگزاروں میں ضم ہو جاتی ہے۔ جبکہ جنوب میں ساحل کے

> متوازی پہاڑیوں کے پار بحر عرب سے ملتی ہے۔ایک چھوٹے سے متراخلی (Re-entrant) حصے کو مستثنیٰ کر دیجئے جو زیادہ سے زیادہ مشرق میں واقع کوہ سلیمان اور کرتھار (کھیر تھر) کے کوستانی محاورے کے درمیان ہے تو یہ ساراخطہ ایران کے سطح مرتفع کا حصہ بن جاتاہے اور جنوب مشرقی ایشیاء کے ہیتئی خط وخال میں سب سے زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے ۔ متذکرہ بالا متداخلی ٹکڑے کوشامل کرتے ہوئے یہی خطہ جس کارقبہ 1,43,000 (ایک لاکھ چوتیس ہزار) مربع میل ہے۔ ہمارے لئے ایک جغرافیائی صوبہ ''بلوچستان'' بنادیتاہے''۔(29)

قدیم بلوچستان کے بارے میں ان مورخین کے حوالہ جات سے عیاں ہوتا ہے کہ نوشیروان عادل کے دور میں بلوچ ویلم، گیلان، ماژندران، صغدانیہ (ماوراالنہر) تک موجود تھے۔ بحیرہ مذکورہ البرز اور کرمان بلوچوں کے ابتدائی مسکن رہے ہیں۔ڈیرہ اسماعیل خان کے شمال میں کوروہ کے نمک کے پہاڑی سلسلے تک بلوچ پھیلے ہوئے تھے۔گومل سے کراچی تک دریائے سندھ کے مغربی دہانے آج بھی بلوچ اکثریتی علاقے کہلاتے ہیں۔ ڈیرہ غازی خان اورجیکب آباد کو نصف صدی سے کم عرصہ قبل سندھ اور پنجاب میں شامل کیاگیا۔ قندھار سے زابل (یعنی ایرانی اور افغانی

زابل) تک پھیلے علاقے کا قدیم نام بیلوص تھا۔ ابن حوقل کے حوالے سے صوبہ کرمان کے مشرق میں مکران، ریگستان اور بحرین (دو سمندر) اور اس کے سرحد پر بلوچ (Bolouje) آباد ہیں۔ اس کے علاوہ لاتعداد حوالے ہیں جو ان علاقوں میں بلوچوں کی اس خطے میں موجودگی کے ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

موجودہ دور میں بھی بلوچ پاکستان میں بلوچستان، سندھ، پنجاب اور خیبر پختونخوا میں آباد ہیں۔ اس کے علاوہ ایرانی بلوچستان سیستان و بلوچستان کے علاوہ کرمان، خراسان بھی بلوچ اکثریتی علاقے کہلاتے ہیں جبکہ ایران کے دیگر علاقوں میں بھی بلوچ آباد ہیں۔ اس کے علاوہ افغانستان میں ہلمند، نیمروز، فراح بلوچ اکثریتی علاقے کہلاتے ہیں اس کے علاوہ بادغین، غور، میمنہ، کندوز، بقلان، کشم، برخشاں، جوزخان، فاریاب، کابل، قندھار میں بھی بلوچ قبائل آباد ہیں۔ اس کے علاوہ خلیج، عرب امارات، مسقط، بحرین، ہندوستان، ترکمانستان، تنزانیہ، یوگنڈا، کینیا، یورپ اور برطانیہ میں بھی آباد ہیں۔

زمانہ قدیم سے تاحال بلوچستان مشرق و مغرب کے درمیان سنگم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ابتدائی دور میں قدیم سلک روٹ کے ذریعے مغرب کا مشرق سے تجارتی رابطہ ہو یا عراقی تمدن کے دور میں مشرقی علاقوں سے ان کا میکن اور ملوہن سے تجارتی روابط، اہل ہند کا فارس اور حجاز مقدس کی جانب بری یا بحری رابطہ ہو یا پھر اہل فارس کا ہندوسندھ کے جانب سفر، مہر گڑھ اور موہن جو دڑو و دیگر تہذیبی علاقوں کے تجارتی روابط کے

دوران بھی بلوچستان کی سرزمین انتہائی اہمیت کا حامل بلکہ مشرق اور مغرب کے درمیان سنگم کی حیثیت رکھتا رہا ہے۔ موجودہ دور میں بھی بین الاقوامی تجارت کے سب سے بڑے سڑک گوادر، کاشغر راہ گذر بھی اسی صوبے سے گذرے گا یوں اس کی اہمیت میں زمانہ قدیم سے زمانہ جدید تک کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

مندرجہ بالا مورخین، محققین اور مصنفین کے حقائق کے اعتبار سے بلوچ زمانہ قدیم سے بندر عباس سے کرمان، کوہ البرز اور بحیرہ حذر کو چھوتے ہوئے ترکمانستان سے ہوتے ہوئے دریائے ہلمند سے افغانی سرحد کے ساتھ وفاق کے زیر اہتمام قبائلی علاقہ جات سے گذرتے دریائے گومل ڈیرہ اسماعیل خان سے دریائے سندھ کے غربی کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے کراچی پھر وہاں سے طویل ترین ساحلی علاقے تک پھیلے ہوئے خطے میں آباد رہے ہیں۔ چند صدیاں قبل سے تا حال بلوچ مسکن رقبے کے متعلق محمد سردار خان بلوچ اسے 3,40,000 مربع کلومیٹر بتاتے ہیں جبکہ آغا گل اسے نوری نصیر خان نصیر دور میں 600,000 مربع کلومیٹر لکھتے ہیں جبکہ جسٹس میر خدا بخش مری اسے 2,50,000 مربع میل بتاتے ہیں۔ آغا نصیر خان احمد زئی کمبرانی اس خطے کا مجموعی رقبہ 2,43,487 مربع میل بتاتے ہیں اس کی تفصیل یوں درج کرتے ہیں۔ پاکستانی بلوچستان کا رقبہ 1,34,000 مربع میل، ایرانی بلوچستان کا رقبہ 69,487 اور افغانی بلوچستان کا رقبہ 40,000 مربع میل بتاتے ہیں۔ اگر ایران میں سیستان کے علاوہ 1960 کی دہائی میں دیئے گئے علاقے،

پاکستان میں دیگر صوبوں میں شامل کئے گئے بلوچ علاقوں کو اکھٹے کر کے رقبہ نکالا جائے تو آغا گل کی جانب سے نصیر خان نوری کے دور میں بیان کردہ رقبہ مکمل ہو جائے گا۔

بلوچوں کے قدیم مسکن والے علاقوں کے درمیان باقاعدہ سرحدی خط کھینچ جانے سے قبل وہ چراگاہوں کی تلاش اور باہمی چپقلشوں کے بنا پر آسانی کے ساتھ ایک جگہ سے وسری جگہ نقل مکانی کرتے تھے۔ گولڈ اسمڈ(اسمتھ) کے ذریعے مکران کو تقسیم کر کے اس کا ایک حصہ فارس کے حوالے کرنے اور ڈیورنڈ لائن کے ذریعے بلوچستان اور افغانستان کے درمیان خط بندی کر کے قدیم بلوچ علاقوں کو مستقل طور پر افغانستان کے حوالے کرنے اور تھوڑے سے (لگ بھگ اس وقت کے ڈھائی ضلع) علاقے کو بلوچستان کے ساتھ ملا کر دو برادر اقوام کے درمیان نفاق کی مستقل بنیاد رکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس سے یہ بات واضح طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ انگریزوں کی یہاں آمد اور گولڈ اسمڈ اور میکموہن ڈیورنڈ لائین کھینچنے کی وجہ نہ صرف خطے میں آباد بلوچوں کو حد بندیوں کے نام مستقل طور پر تقسیم کر دیا گیا بلکہ صدیوں سے ساتھ انہی والی برادر اقوام کے درمیان میں نفاق کی دراڑ ڈالی گئی۔ انگریزوں کے خطے سے ظاہری واپسی کے باوجود یہاں بیرونی طالع آزماؤں کے مفادات کے طویل جنگ نے یہاں کے پر امن معاشرے کو آگ میں لپیٹنے کی کوشش ہوئی یہ حالات ہمارے خطے کو مستقبل میں کسی جانب لے جائیں گے۔ اس کا فیصلہ تاریخ کرے گی۔

حوالہ جات:

1۔اے ڈیلیو ہیوز2011اشاعت دوئم (مترجم انور رومان) سرزمین بلوچ، گوشہ ادب کوئٹہ۔ ص۔20-21

2۔فاروق بلوچ۔2012۔خان اعظم میر نصیر خان نوری، فکشن ہاؤس لاہور۔ص۔17

3۔ڈاکٹر واحد بخش بزدار، 2008، بلوچی زبان، لسانی تاریخ وارتقاء، مرکز مطالعہ پاکستان، جامعہ بلوچستان کوئٹہ۔ص۔21

4۔ آغا گل۔2010۔بلوچی بائیبل کی تاریخ۔ایر ریکسن پرنٹرز لاہور۔ص۔14-15

5۔عنایت اللہ بلوچ۔1987ء، دی پرابلم آف گریٹر بلوچستان۔اے کس اسٹڈی آف نیشنلزم، جی ایم بی ایچ سٹٹ گرٹ۔جرمنی۔ص۔19

6۔ جسٹس میر خدا بخش مری، 1985ء۔دی سرچ لائیٹس آف بلوچیز اینڈ بلوچستان، نساء ٹریڈرز کوئٹہ۔ص۔22

7۔ سلیم خان گمّی۔1990 (اشاعت دوئم) بلوچی ادب، بلوچ ثقافت، مطبوعات النساء پٹیل رود کوئٹہ۔ص۔13

8۔ مولانا ابو لکلام آزاد۔2012۔اصحاب کہف ویاجوج ماجوج، مکتبہ جمال۔لاہور۔ص۔52

9۔مظہر علی لاشاری۔2001۔بلوچ تاریخ کے آئینے میں۔مرکز علم وعرفان۔لاہور۔ ص۔18-19

10۔احمد یار بلوچ۔2007۔تاریخ بلوچ قوم وخوانین بلوچ۔العصر پبلیکیشنز لاہور۔ص۔32

11۔میر احمد یار۔1975۔ان سائیڈ بلوچستان، رائل بک کمپنی۔کراچی

12۔ڈاکٹر عبد الرحمن براہوئی۔2009۔(اشاعت سوئم) بلوچستان اور پاکستان کی الحاق کی کہانی، قلات پبلشرز ایوان اشاعت کوئٹہ۔ص۔18

13۔ڈاکٹر حمید بلوچ۔2012۔بلو چ، افغان، پرشین باؤنڈری کیس، سید ہاشمی ریفرنس

لائبریری۔ کراچی۔
14۔ کامران اعظم سوہدروی۔ 2007۔ بلوچ قبائل، تخلیقات لاہور۔ ص۔ 19-20
15۔ میر نصیر خان احمد زئی 1988۔ تاریخ بلوچ و بلوچستان، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 1
16۔ احمد خان قیصرانی۔ 2005۔ بلوچ قوم اور تاریخی حقائق، پائلٹ ایجوکیشنل پروڈکٹس۔ لاہور۔ ص۔ 38
17۔ مولائی شیدائی۔ 1994۔ سرزمین بلوچ۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ
18۔ تاج محمد بریسگ۔ 2004۔ بلوچ نیشنلزم اٹزاور یجن اینڈ ڈویلپمنٹ رائل بک سٹی۔ کراچی
19۔ مولانا نور احمد فریدی۔ 2002۔ (بار دوم) بلوچ قوم اور اس کی تاریخ، قصر الادب رائٹرز کالونی ملتان
20۔ ماریہ ملک۔ 2013۔ بلوچستان کونونڈرم۔ دی رئیل پر سپکٹو۔ پورب اکیڈمی۔ اسلام آباد
21۔ سنگی۔ 2009۔ بلوچستان تنازعات اور محرکات، سنگی ڈویلپمنٹ فائونڈیشن اسلام آباد
22۔ عنایت اللہ بلوچ (مترجم ریاض محمود انجم) 2014 بلوچستان کا مسئلہ۔ قوم پرستی کا ایک جائزہ جمہوری پبلیکیشنز۔ لاہور۔ ص۔ 43-44
23۔ اثیر عبدالقادر شاہوانی۔ 2012۔ بلوچی زبان وادب۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 2
24۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیئر جھالاوان۔
25۔ محمد سردار خان بلوچ (مترجم انور رومان) بلوچ قوم۔ نسل کی تاریخ، گوشہ ادب۔ کوئٹہ
26۔ ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی۔ 2015۔ بلوچ ان سرچ آف آئیڈ نٹنٹی، وریکلز۔ واشنگٹن۔ ص 21
27۔ نصیر دشتی۔ 2017۔ دی بلوچ کنفلیکٹ و دایران اینڈ پاکستان۔ ٹرافرڈ پبلشنگ۔ امریکہ۔ ص۔ 29
28۔ ش ضعیٰ۔ 1975۔ ہمارا بلوچستان۔ بولان بک کارپوریشن۔ کوئٹہ۔ ص۔ 63-64
29۔ ڈسٹرکٹ گزیٹر سیریز۔ محکمہ آثار قدیمہ بلوچستان کوئٹہ

بلوچ کون ہیں اور کہاں سے تعلق رکھتے ہیں

بلوچ کون ہیں ان کا خمیر کہاں سے اٹھا؟ ان کا قدیم وطن کون سا ہے؟ حسب و نسب کیا ہے؟ ان سوالات کے جواب ڈھونڈنے کی کوشش میں لاتعداد خود ساختہ اندازوں اور زاویوں کے پیمانے، من گھڑت مفروضوں کے ساتھ ساتھ مورخین، محققین، متشرقین اور حتیٰ کہ بلوچ تاریخ نویس بھی صدیوں تک ان قیاس آرائیوں کے دلدل میں دھنسے نظر آتے ہیں۔ یہ بدگمانیاں نہ صرف حقائق کی پردہ پوشی کا سبب بنی رہیں بلکہ بلوچوں کے باہمی اتفاق کے ماحول پر بھی اثر انداز ہوتی جارہی ہیں۔ خود ساختہ اندازوں اور زاویوں کی بنیاد پر انہیں نسلی امتیاز اور گروہی تقسیم کے ذریعے باہمی دست و گریبان کرنے کی کوششیں کر کے اپنے مفادات و عزائم کی تکمیل کی راہ ہموار کی جاتی رہی ہے۔ یہ تاریخی جبر ہے کہ ہزارہا سال سے اپنی ہی سرزمین پر آباد باشندوں کو درآمد قرار دے کر ان کے اپنے قدیم وطن سے دائمی محبت کی تسلسل کو کمزور بنانے کی سازشیں ہوتی رہی ہیں۔

میر غوث بخش بزنجو کہتے ہیں "یہ سرزمین بلوچوں کی مادر وطن رہی ہے، البتہ زمانے کے نشیب و فراز، عالمگیر حملہ آوروں کی تگ و تاز سکندر اعظم، چنگیز خان، منگول تیمور و نادر شاہ افشار جیسے باجبروت فاتحین کے پر آشوب ادوار میں گو کہ اس سرزمین کی حدود میں تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے اور بسا اوقات عارضی طور پر اس کے چھوٹے بڑے حصے دوسری مملکتوں میں شامل کئے جاتے رہے ہیں، لیکن من

الحیث القوم اس پر مالکانہ حقوق ہمیشہ بلوچوں کے قائم رہے ہیں" بلوچ کے متعلق یونانی عرب، ایرانی، روسی، ہندی، برطانوی مورخین، محققین، متشرقین، سیاحوں، جغرافیہ دانوں اور سرحدی افسران کے خیالات اور بلوچ تاریخ نویسوں کی عرق ریزی کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو درج ذیل آراء سامنے آتی ہیں۔

1۔ بلوچ عرب ہیں، شام کے علاقے حلب میں رہائش پذیر تھے اور حضرت حمزہ کی اولاد میں سے ہیں۔ واقعہ کربلا کے بعد ملکِ عرب چھوڑ کر پہلے کرمان اور پھر مکران میں آباد ہوئے۔

2۔ بلوچ بابل (عراق) کے رہائشی ہیں۔ ان کے مطابق بلوچ (بلوص) بابل کے بادشاہ نمرود کا لقب تھا، وہ وہاں سے ہجرت کر کے موجودہ علاقوں تک پھیل گئے۔

3۔ بلوچ قوم ایرانی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بلوچ کا نام ہمیشہ کوچ کے ساتھ آیا ہے جو کہ اصل میں ایک ہی قوم کی دو شاخیں ہیں۔ یہ ابتدائی طور پر ایران کے شمال مشرقی علاقے میں آباد ہوئے جو کہ بحیرہ حذر کے قرب و جوار میں تھا۔ وہاں سے مختلف علاقوں تک پہنچے۔

4۔ بلوچ ہیلمند سے بحرِ بلوچ اور کوہ سلیمان سے کوہ البرز کے درمیانی علاقے میں آباد قدیم قوم ہے۔ کبھی بڑے بڑے مراکز اور کبھی چھوٹے چھوٹے اتحادیوں کی شکل میں مختلف ناموں کے ساتھ یہاں آباد رہے ہیں، اور یہیں سے مختلف وجوہات کے باعث دیگر علاقوں اور ممالک تک پھیل گئے۔

تاریخ کے بکھرے اوراق ہمیں بہت سے حقائق واضح کرکے دکھاتے ہیں۔ ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو بہت سی قباحتیں واضح ہوجاتی ہیں۔ ہنحا منشی بادشاہ کی جانب سے 479-80 قبل مسیح میں یورپ پر حملے کے بارے میں دنیا کی تاریخ کے مورخ ہینری ولیم سمتھ لکھتے ہیں ”ہنحا منشی بادشاہ زرکسز نے جب یورپ پر حملہ کیا اور ڈورسکس (Doriscus) کے میدان میں اس کے ماتحت 56 قومیں اپنی اپنی پوشاک میں اپنے اپنے پرچم لے کر حاضر ہوئیں تو اس نے قوموں کی فہرست مرتب کی تو ان میں ایک قوم بلوچ تھی۔“(1)

مشہور و مستند یونانی مورخ ہیروڈوٹس جس کو ابوالتواریخ بھی کہا جاتا ہے۔ ”انہوں نے بھی (Doriscus) میں موجود مختلف اقوام کے نام لکھے ہیں۔ ان میں یوتی، پاریکانی، مائشی، سوگدی، ماکرونی وغیرہ شامل ہیں۔ واضح رہے کہ آج بھی بلوچوں میں ہوت، پرکانی، محمد شہی، ساجدی اور مکرانی کے نام سے قبائل اور گروہ موجود ہیں۔“(2)

قدیم تاریخِ ہند کے مصنف ونسنٹ اے سمتھ رقمطراز ہیں ”گدروشیا کے صوبے میں بلاشک وشبہ اوریتی اور اربوئی ملک اور گدروشیہ صوبہ شامل ہے۔ اوریتائی کے متعلق فرض کیا جاتا ہے کہ اب تک ان کے قائم مقام لسبیلہ کے لمری قبائل ہیں (واضح رہے کہ تاریخ دانوں نے ان کو نہمردی اور نمری بھی لکھا ہے) گدور جو لمری قوم میں شامل ہیں، ممکن ہے کہ گدروسو کے قائم مقام ہوں۔

سندھی زبان کے شہرہ آفاق شاعر اور شاہ جو رسالو کے خالق شاہ عبد اللطیف بھٹائی نے اپنی تخلیق میں عشقیہ داستان ''سسی پنوں'' کو بڑے پیمانے پر موضوع سخن بنایا ہے، وہ پنوں کو کیچی، باروچا، جت، ہوت، جام، عاری، عاریانی اور کوہیار کے نام سے زینتِ قلم بناتے ہیں۔ واضح رہے کہ میر عالی ہوت سے نسبت رکھنے والے لسبیلہ کے والی عالیانی کہلاتے ہیں اور جام ان کا لقب ہے۔ بلوچستان میں موجود جدگالی زبان بولنے والے بلوچ اپنے آپ کو جاموٹ لکھتے ہیں۔ تاریخ دان بتاتے ہیں کہ یہ بھی جام ہوت کی بگڑی ہوئی شکل ہے، کیوں کہ ہمیں ابتدائی دستاویزات واضح کرتے ہیں کہ بلوچوں کی اس خطے میں تین زبانیں ہیں۔ بلوچی، کردگالی اور جدگالی۔

ملک اللہ بخش وزیر دربار قلات اور میر احمد یار خان بلوچ خان قلات اپنی تصانیف میں لکھتے ہیں ''بلوچ اور کرد ایک قوم ہیں، زمانے کے انقلابات نے انہیں دو نام دے کر جدا کیا'' (4) محمد عرفان خان گبول کہتے ہیں ''کرد اپنی تاریخ آج سے چار ہزار سال قبل گوتو (Gutu) نامی طائفہ میں تلاش کرتے ہیں۔ جو میدقبائل کے آباؤ اجداد میں سے تھا'' بیسویں صدی سے تعلق رکھنے والے نامور مورخ ولادیمیر منارسکی جو کرد پر تحقیق پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ''تاریخی اور لسانی بنیاد پر اسی نظریے کے قائل ہیں کہ میدہی کرد قوم کی بنیاد ہے'' (5)۔ ٹی۔ جے۔ ایل مئیر لکھتے ہیں ''بلوچ قدیم میدوں کے پسماندگان میں سے ہیں''۔ محترم حسن ارفع اپنی کتاب میں یہی خیال سامنے لاتے ہیں کہ ''میدہی کردوں کی بنیاد ہیں'' مولانا نور احمد فریدی کے مطابق ''بلوچ اور کرد دونوں ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں'' (6) جبکہ رابرٹ

کالڈویل بھی پروفیسر اوپیرٹ کے حوالے سے ایران کے قدیم نبشتوں کی زبانوں میں سے عیلامی زبان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو نسلی طور پر مید لکھتے ہیں۔ ”میدوں نے 2334 قبل مسیح میں عراق اور 900 قبل مسیح میں ایران پر بادشاہت کی ہے اور قدیم نسل ہے۔(7) مورخین طبری، بلاذری، قاضی اظہر مبارک پوری، اعجاز الحق قدوسی، ڈاکٹر محمد اسحاق بھٹی، شاہد حسین رزاقی اور ڈاکٹر عبدالرحمن براہوئی اپنی اپنی تصانیف میں طوران، مکران، دیبل، کیکان کے نام سے بلوچستان کے علاقوں میں میدوں کی آبادی کا ذکر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں ”عرب دور میں راشد بن عمرو بن قیس عبدی الازدی کیکان پر حملہ آور ہونے کے بعد میدوں کے ساتھ مقابلے میں جان کی بازی ہار جاتے ہیں اور اسی طرح سنان بن سلمہ کے ساتھ بھی میدوں کی مد بھیڑ کا ذکر کرتے ہیں“۔(8) تاریخ نویس عرب دور میں پہلے سندھ اور بعد میں خراسان کے گورنر مقرر ہونے والے جنید بن عبدالرحمن المری اور مکران کے گورنر محمد بن ہارون بن ذراع النمری کو بھی بلوچ لکھتے ہیں واضح رہے کہ مری، آزدی اور نمری قبائل آج بھی بلوچ قوم کا حصہ ہیں۔

تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ میدین دور میں کرمان کے علاقے میں سوران نامی کرد امیر رہائش پذیر تھے۔آج بھی ایران کے صوبہ بلوچستان کے ساراوان ڈویژن میں ایک ضلعے کا نام سب و سوران ہے۔اس کے علاوہ سوران نامی متعدد قصبے اور دیہات موجود ہیں۔بلوچ تاریخ میں نامور جرنیل چاکر اعظم کی مرکزیت کے دوران بلوچوں کا دارالخلافہ سوران تھا جو کہ آج بھی بلوچوں کے بڑے

تمن رند قبیلے کے سربراہ کا مسکن ہے۔ بلوچستان کے تہذیبی آثار سے مالا مال علاقہ بارکھان میں بھی سوران نامی جگہ موجود ہے۔ شام کے علاقے حلب سے 10 کلومیٹر کے فاصلے پر سوران نامی قصبہ موجود ہے۔ عراق کے علاقے کردستان کے علاقے اربل میں سوران نامی وسیع علاقہ موجود ہے، سوران جامعہ بھی ہے اور وہاں پر آباد کردوں کی زبان کا ایک الگ لہجہ ہے جس کو ''سورانی'' کہتے ہیں جو کہ بلوچی زبان سے زیادہ قربت رکھتا ہے۔ اسی طرح عراق میں ال مری نامی تہذیبی نشان، ترکمانستان میں بلوچوں کی آبادی والے علاقے کا نام بھی ''ماری'' ہونا اور بلوچستان میں مری قبیلے کے جائے ''مسکن کو مری کوہستان ''کا نام دینا۔ عراق میں قلعہ اور دیوتا کا نام بعلوث ہونا، راورٹی، جی پی ٹیٹ، جی لی اسٹرینج ملک الشعراء (فارسی) بہار، فاروق بلوچ اور دیگر مورخین کا قندھار اور اس کے گردونواح کے وسیع علاقے زابل تک کے قدیم نام کو بالوص، بالستان، بلوص یا والشان لکھنا، اس کے علاوہ ایران، افغانستان، عراق اور پاکستان بلوچ نسل سے تعلق رکھنے والے علاقوں کے ناموں میں یکسانیت ان کی باہمی ربط کو واضح کرتے ہیں۔

مہر گڑھ سمیت بلوچستان کے طول و عرض میں تہذیبی آثار کی دریافت کے تسلسل اور ان کے سماج کی معاشرتی زندگی پر عکس اور ربط اور نال تہذیب کے متعلق ماہرین آثار قدیمہ کہتے ہیں کہ یہ ساڑھے پانچ ہزار یا ساڑھے چار ہزار سال قدیم ہے جہاں سے دریافت ہونے والی انسانی کھوپڑی کے بارے میں ڈاکٹر ایم آر ساہنی اپنی کتاب ''انسانی ارتقاء'' میں لکھتے ہیں ''یہ کھوپڑی بلوچستان کے مقام نال سے

دریافت ہوئی ہے۔یہ لمبوتری بیضوی قسم کی ہے اور اس میں کافی بڑے دماغ یعنی 450مکعب فٹ کی گنجائش ہے۔ نفیس طبی ناک اس امر کا پتہ دیتی ہے کہ وہ اس علاقے میں آباد موجود لوگوں سے کافی حد تک ملتا جلتا ہے"۔(9)اسی طرح وادی مہران میں موئن جو دڑو پر کام کرنے والی برطانوی ماہر آثار قدیمہ مورٹائمر وہیلر وہاں سے ملنے والی مورتی کے متعلق لکھتی ہیں" یہ بلوچی انداز کا چہرہ ہے"۔(10)اس کے علاوہ لاتعداد تہذیبی شواہد واضح کرتے ہیں کہ بلوچ اس خطے کے قدیم باشندے ہیں۔ واضح رہے کہ بلوچستان میں دریافت آثار قدیمہ کے حوالے سے اب تک کوئی قابل ذکر تحقیق نہیں ہو پائی ہے۔ تاہم ابتدائی معلومات سے بہت سی چیزیں واضح ہوئی ہیں ماہر آثار قدیمہ جمیل حسین بلوچ لکھتے ہیں" یہ تہذیبی و ثقافتی دریافتیں بلوچ ثقافت کے طرہ امتیاز کو واضح کرتے ہیں اور اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ بلوچ اس سرزمین کے قدیم اور اصل باشندے ہیں"۔

فاروق بلوچ کہتے ہیں:

"بلوچ کا خمیر اسی دشت لوط، بحیرہ ہیر کانیہ، کوہ قفص، مکران وساحل مکران، دشت بیلہ، سبزہ زار توران وقیقان، دشت فرگاہ کانک ومستونگ، راہ بند بولان اور سرزمین پہلوانان سیستان سے اٹھایا گیا"۔(11)

مندرجہ بالا تاریخی، جغرافیائی اور تہذیبی حقائق واضح کرتے ہیں کہ بلوچ، بالوص، بعلوث، بالاشچک، اوریتاتی، یوتی، مید، میکن، میکیا، ماگا، ماہی خوران، کیچی،

رند، ہوت، گدروشیائی، کوچ و بلوچ، براخوئی، براہوئی، جد گال، جاموٹ ناموں سے میکیا، گدروشیا، کیکان ، توران ، سیستان ، کوہ البرز، مکران، زابلستان، سجستان، کردستان، بالشکان، والشان، آراچوشیا و دیگر لاتعداد ناموں سے مشہور علاقہ جات میں مسکن رکھنے والے بلوچ، مید، کرد قبائلی و نسلی اعتبار سے ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ وسیع قومی اجتماعیت اور چھوٹے چھوٹے مرکزیت اور اتحادیوں کی شکل میں اپنے وسیع جغرافیائی حدود علاقے میں ہزارہا سال سے آباد ہیں۔ مگر حالات، واقعات اور مورخین کی موقع پرستی یا پس پردہ عزائم کی وجہ سے ان کی شناخت الگ الگ بیان کرکے الجھنوں کی دیواریں کھڑی کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی لیکن حقائق سے ہٹی دھول نے ان کے خواب چکنا چور کر دیئے ہیں۔

حوالہ جات:

1۔ونسنٹ اے سمتھ۔2007۔قدیم تاریخ ہند مترجم محمد جمیل الرحمن، تخلیقات۔لاہور

2۔ہیروڈوٹس۔2013۔دنیا کی قدیم ترین تاریخ، نگارشات۔پبلشرز۔لاہور

3۔ملک اللہ بخش۔2014۔بلوچ قوم کی تاریخ کے پریشان اوراق۔بولان بک کارپوریشن کوئٹہ

4۔احمد یار بلوچ۔2007۔تاریخ بلوچ و خوانین بلوچ۔العصر پبلیشرز۔لاہور

5۔محمد عرفان گبول۔2014۔گبول قبیلہ۔عہد قدیم سے عصر حاضر تک۔ادارہ تحقیق۔علی پور

6۔مولانا نور احمد فریدی۔2002۔بلوچ قوم اور اس کی تاریخ۔قصر الادب۔ملتان

7۔ڈاکٹر عبدالرحمن براہوئی۔1990۔بلوچستان میں عربوں کی فتوحات اور حکومتیں۔قلات پبلشرز۔کوئٹہ

8۔ڈاکٹر عبدالرحمن براہوئی۔2014۔بلوچستان میں صحابہ کرام۔براہوئی اکیڈمی کوئٹہ

9۔ڈاکٹر ایم آر سانہی۔2014۔انسانی ارتقا، بک ہوم۔لاہور

10۔میاں آصف خورشید۔2010۔مجسموں کی دنیا۔فکشن ہاؤس۔لاہور

11۔فاروق بلوچ۔2012۔بلوچ اور ان کا وطن۔فکشن ہاؤس۔لاہور

شاہ لطیف کی شاعری میں تذکرہ بلوچ

شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ (1689-11-18__1752-01-01)سندھ کے نامور صوفی، محقق اور شاعر ہیں۔ سندھ کے لوگ عقیدتاً اسے "لا کھینٹر و لطیف"، "لطیف گھوٹ"، "بھٹائی" اور "بھٹ جو شاہ" بھی کہتے ہیں۔ وہ شہرہ آفاق کتاب "شاہ جو رسالو" کے تخلیق کار ہیں۔ یہ کتاب سندھی ادب کا انتہائی اہم شہہ پارہ شمار ہوتا ہے۔ شاہ لطیف سندھی ادب کے میدان میں کلیدی حیثیت کے مالک ہیں۔ محققین کے مطابق وہ حضرت محمد صلعم، جلال الدین محمد بلخی المعروف مولانا رومی، ابو حمید بن ابو بکر ابراہیم المعروف فرید الدین عطار، ابو محمد مصلح الدین بن عبد اللہ شیرازی المعروف شیخ سعدی اور شاہ حسین سے متاثر تھے۔ شاہ جو رسالو جس کو ارنسٹ ٹرمپ "دیوان" کہتے ہیں۔ جس کو اسی نے ترتیب دیکر تصحیح کر کے 1866 میں لی پنگ جرمنی سے شائع کیا۔ ان کے بعد اس پر مرزا محمد قلیچ بیگ، علامہ غلام مصطفی، کلیان آڈوانی، دین محمد وفائی، ڈاکٹر گر بخشانی، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، پیر حسام الدین راشدی، علامہ آء آء قاضی، ایلسیا قاضی، جی ایم سید، بھیرومل آڈوانی، علامہ محمد شاہانی، و دیگر درجنوں علماء، دانشوروں، محققین اور ادیبوں نے تحقیق و تدوین کرتے ہوئے قلم کشائی کی ہے۔ شاہ جو رسالو میں روایتی طور پر تیس سُر بتائے گئے ہیں، جن میں کلیانٹر، ایمن کلیانٹر، کھمبھاٹ، سُری راگ، سامونڈی، سونہڑی، سسئی آبری، معذوری، دیسی، کوہیاری، حسینی، لیلاں چنیسر، مومل رانڑوں، مارئی، کاموڈ، گھاتُو، سورٹھ، کیڈارو،

سارنگ، آسا، ریپا، کھاہوڑی، برۄوسندھی، رام کلی، کاپاتی، پورب، کریال، پربھاتی، ڈہر اور بلاول شامل ہیں۔ ان سُروں کے درمیان اور شاہ جو رسالو میں سات محبت کی داستانیں مارئی، مومل، سسئی، نوری، سوہنی، سورٹھ اور لیلانامی خواتین کے کرداروں سات سورمیوں کی جرات، بہادری، ہمت، پیار، اخوت اور وطن کے محبت کے جذبے کو احسن طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری میں عربی، فارسی، ہندی، بلوچی، براہوئی، سرائیکی اور دیگر زبانوں کے بامعنیٰ الفاظ موجود ہیں، لیکن پانچ سروں، سُر سسئی آبری، سُر معذوری، سر دیسی، سُر کوہیاری اور سر حسینی میں کیچ کے ہوت بلوچ شہزادے ”دوستین المعروف پنّوں“ یا سسئی پنوں کے محبت کی داستان پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ بلوچوں کی بہادری، جوانمردی اور اول العزمی کا خوب ذکر کیا، اِن سُروں میں انہوں نے بلوچی زبان کے الفاظ کثرت کے ساتھ استعمال کئے ہیں، دلکش بات یہ ہے کہ جب کیچ اور بھنبھور کے تعلق، میر عالی ہوت کے بیٹے پنّوں کے عشق اور سسّی کی چاہت، محبت، عشق اور جدائی کے لمحات کی آہ وزاری اور تکالیف کو بیان کرتا ہے تو وہ بلوچستان کے بلوچوں کی دوسری بڑی زبان براہوئی کے الفاظ کو بھی پنوں کے بارے میں کہے گئے اشعار میں استعمال کرتا ہے۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں، ؎

جِے کرر َوان رَوش مرَوشی محبوب ڈے

مَناکشی مولدِی، دیماپنہوں دوش

تھئی گوانکاں منی گوش، سُنڑیں ماں سکھیتھیاں (1)

....

ب دِ اسادِ اکادِ اڑے ہَند اڑے ھُئام

ہُر داساہِن حال جا' ہتے ہوت ڈِھام

پَذیرِی اِیندام، پائے پیچ پریت جو(2)

شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ نے اپنے رسالو کے ہر سُر اور ہر واقعے کو بیان کرتے ہوئے وہاں بولی جانے والی زبان کے لفظوں، لہجوں اور استعماروں، وہاں کے ماحول، وہاں کے چرند پرند، معاشی اور معاشرتی حالات کی عکس کشی کی ہے۔ جب وہ پنوں کا ذکر کرتے ہیں تو اسے بلوچ، باروچا، جت، ہوت، جام، عاری، عاریانی، کیچی اور کوہیار کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :

لے گئے میرے پریتم کو، وہ ظالم دیور جام

دیا تھا آن کے ہوت پنہل کو "آری" کا پیغام

سب نے ایسی کی تھی سازش، ڈالا تھا اک دام

دھوکے سے وہ لے گئے سکھیو! میرا ہوت وریام

ظلم کے لئے ہر گام اٹھایا، ان شہہ زور جتوں نے(3)

(شاہ جو رسالو۔ آغا سلیم)

اس شعر میں وہ دوستین یعنی پنّوں کے بھائیوں کو جام لکھتا ہے ساتھ ہی پنوں کے والد "میر عالی" کو "آری" لکھتا ہے، پھر انہیں شہہ زور جت بھی کہتا ہے۔

ایک دوسرے شعر میں وہ لکھتے ہیں :

راہ یار میں آڑے آئے، یہ اونچے کہسار

برفت اور بروہی لے گئے، میر اوہ کوہیار

روتی ہوں اے یار، کہ دیکھوں تیری صورت

(شاہ جو رسالو۔ آغا سلیم)

اس شعر میں وہ پنّوں کے بھائیوں کو برفت اور بروہی بھی کہتا ہے۔ واضح رہے کہ وہ پنّوں کو کوہیار بھی کہتا ہے، کوہیار کے لفظی معنٰی پہاڑوں کے دوست کے ہیں، لیکن میر نصیر خان احمد زئی کے مطابق 854ق م سے قبل خضدار کا نام امیر عضدار کرد کے حاکم بننے سے عضدار پڑا جو پھر قصدار، قزدار سے بدلتے بدلتے خضدار ہوا جبکہ اس سے قبل خضدار کا نام کوہیار تھا۔ شاہ عبد اللطیف کے ایک پورے سُر کا نام کوہیاری ہے۔

جن سُروں میں ان کا ذکر کرتے ہیں تو بلوچستان کے پہاڑوں، پہاڑی چوٹیوں، آب وہَوا، ماحول کا دلکش انداز میں ذکر کرتے ہیں۔ کیچ کے والی کے بیٹے کے لئے کہے گئے اشعار میں بلوچی زبان کے ساتھ ساتھ براہوئی زبان کے الفاظ کو استعمال کرتے ہیں۔ ان الفاظ کے استعمال اس جانب واضح اشارہ کرتے ہیں وہ براہوئی زبان کو بھی بلوچوں کی زبان سمجھتے ہوئے اس داستان کے ہیر و پنّوں کو اس کے دونوں زبانوں یعنی بلوچی اور براہوئی میں بات کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ پنوں کے بھائیوں کو ہوت آری کی اولاد، جام کوہیار، جت، باروچا، خان باروچا، بلوچ کے ساتھ ساتھ

برفت اور بروہی بھی لکھتے ہیں۔ سندھ کے نامور سیاسی رہنما اور دانشور جی ایم سید نے بھی لطیف کے کلام کا خوبصورتی سے جائزہ لیا ہے اور پیغامِ لطیف کے نام سے کتاب شائع کرائی۔ وہ اپنے کتاب میں لطیف کے بلوچوں کے ساتھ جڑت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں۔

" شاہ کو بلوچ قبیلہ سے کچھ خاص لگاؤ ہوگیا تھا۔ وہ ان کی بہادری، اولالعزمی، قول وزبان کی پختگی اور قائدانہ صلاحیتوں کا مشاہدہ کرچکے تھے اور کلہوڑوں کی مذہب کے نام پر خود سر اور فسطائی حکومت اور اس کی منافقانہ پالیسیوں سے بیزار ہوچکے تھے۔ چنانچہ وہ بلوچوں کے ذریعے سندھ میں تبدیلی کی علامتیں دیکھنے لگے تھے اور اس کے لئے بلوچوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے اور ان کی ہمت افزائی کرنے پر مستعد ہوگئے تھے۔ شاہ صاحب کے کلام کے پورے پانچ سُر بلوچوں کے قصے، کہانیوں، کرداروں اور ان کی تعریفوں سے پُر ہیں۔ بلوچوں کی توصیف میں ان کے بعض مصرعے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں۔ چند ایک ملاحظہ ہوں۔ (4)

ے برَہ آءُ بلوچ جی، بھیڑی کیُس باند (5)

بلوچ کی محبت نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا ہے

ے بارو چانڑی ذات مناں مُور نہ وِسرے

یہ بلوچ ذات۔ دل سے اس کی یاد فراموش ہی نہیں ہوتی

ے

کوجو آئیُس کوڈ۔

بارو چانڑی ذات سیں

بلوچ سے دوستی رکھنے کے بعد ہی مجھے عشق کا مطلب سمجھ میں آیا ہے

ے آہیاں کمینتڑی ذات۔ بلوچی نہ جُڑاں

میں تو کم ذات ہوں۔ بلوچوں (جو اعلیٰ نسل کے ہیں) کے کسی طرح ہم پلہ نہیں ہو سکتی۔

ے ڈٹھا جے بلوچ، موں جیئں اکھیئن سیں

کاش کہ تُو میرے محبوب بلوچ کو میری نگاہوں سے دیکھ سکے

ے جے ہی، جے، تے ہی، تہ بہ، باہی بارو چل جی

میں جیسی بھی ہوں، مجھے اس پر فخر ہے کہ میں بلوچ کی کنیز ہوں

ایک جگہ پر بلوچوں کی سیاسی قیادت کے بارے میں واضح اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ے جِن ہَن جو آری جام اگ وانڑ، تِن ہن کھے کانہے باکھ بہر جی

جس کا آری جام (بلوچ) قائد ہو اسے کسی طرح کا کوئی اندیشہ نہیں ستاتا۔

شاہ صاحب کی یہ امیدیں اور پیش گوئیاں جلد ہی پوری ہو گئیں۔ کلہوڑوں کی حکومت ختم ہوئی اور ان کی جگہ بلوچ حکمران ہو گئے۔ بلوچوں سے دیرینہ لگاؤ کا ایک جگہ اس طرح اظہار کرتے ہیں۔

ے جَڈڈاں کُن فیکون، چئِ نیو آریانڑی ارواح

جس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا پیدا کی، اسی وقت میرا مَن، روح اور دل بلوچ نے لے لیا۔

بلوچوں سے ملنے یا تعلق رکھنے میں وہ خاص خوشی محسوس کرتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں۔

؎ اَچے آری جام جو وَنڑوَنڑ مَنجھاں وَاس

مجھے ہر شاخ و شجر سے آری جام (بلوچ) کی خوشبو آتی ہے۔

؎ پَسندے ئی پُنہوں کھے اکھین کیو آرام

میری آنکھیں روزِ اول سے بے چین و پریشاں تھیں لیکن جیسے ہی پنہوں پر نظر پڑی انہیں آرام آگیا۔

ایک اور جگہ دل کی گہرائیوں سے بلوچوں کو ان لفظوں میں دعا دیتے ہیں۔

؎ اللہ آرتیچن کھے کُوسو لگے نہ واءُ

اے اللہ! بلوچوں کو آلام وابتلا کی گرم ہواؤں سے محفوظ رکھ۔

ان کی جوانمردی اور جنگجوئی کی تعریف میں کہتے ہیں:

؎ کٹاروایں کواس اَگنڑ آری جام جے

جدال و قتال تو میرے بلوچ کے آنگن کے کھیل ہیں۔

بلوچ ہونا یعنی شاہ صاحب کی پسندیدہ خصوصیات کا حامل مرد ہونا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ کردار اپنانے کے لئے ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دینے کا حوصلہ پیدا کرنا ہو گا۔ ذاتی اور قومی خودداری کا جذبہ پیدا کرنا ہو گا۔ لالچ اور خوف کے مقابلہ میں ثابت قدمی ثابت کرنی ہو گی، اور حریت و حق پرستی کی راہ اختیار کرنی ہو گی"۔

شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ نے واقعی بلوچ کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا اور صدیوں قبل بلوچوں کے زبانوں کو اپنی شاعری میں بھرپور طریقے سے شامل کیا ہے۔ وہ سب محبت، اخوت، بھائی چارے اور اتفاق کے فروغ کے لئے تھا۔ خداوند ہم سب کو لطیف کے خواہشات کے عین مطابق بلوچ قوم کا مستقبل روشنی کے جانب رواں کرنے کی جدوجہد کرنے کی توفیق دے۔ آخر میں شاہ لطیف کا کلام یوں ہے:

؎ آج میں پوچھوں تجھ سے، کیسے ڈھونڈے گی کوہیار

حدِ نظر تک صحرا پربت، اپنا آپ بسار

جب تک ملے نہ یار، بندھا ہو پریت کا بندھن

حوالہ جات:

1۔ محمد قاسم راہموں۔ 2013۔ شاہ جو گنج۔ روشنی پبلیکیشنز کنڈیارو

2۔ مرزا قلیچ بیگ۔ 2007۔ شاہ جو رسالو۔ سندھی لینگویج اتھارٹی۔ حیدر آباد

3۔ آغا سلیم۔ 1992۔ شاہ جو رسالو (ترجمہ) لوک ورثہ اسلام آباد

4۔ جی ایم سید۔ 2013۔ پیغام لطیف۔ فکشن ہاؤس۔ لاہور

5۔ اللہ داد جنجھی۔ 2008۔ شاہ جو گنج۔ کویتا پبلی کیشنز حیدر آباد

سبی: بلوچوں کا قدیم شہر

سبی بلوچستان کا قدیم تاریخی شہر ہے۔ جسے 1908 میں ضلعے کی حیثیت ملی۔اسی ضلعے کی کھوکھ سے 1974 میں نصیر آباد اور کوہلو 1983 میں ڈیرہ بگٹی 1986 میں زیارت اور 2007 میں ہرنائی ضلعے نے جنم لیا۔ موجودہ ضلع سبی 5304 مربع کلومیٹر دو تحصیلوں لہڑی، سبی اور اس کے بعد کٹ منڈائی اور سانگان سب تحصیل بنائے گئے اور پندرہ یونین کونسلوں پر محیط صوبے کا دسواں چھوٹا ضلع بنا پھر اس سے لہڑی کو بھی الگ کر کے ضلع بنایا گیا۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر کے مطابق اس کا نام اوائلی ہندو حکمران سیوا خاندان کی شہزادی "سیوی" کے نام منسوب بتایا گیا ہے۔(1) بلوچ سرزمین کی جزو کی حیثیت سے سبی سے بھی بلوچستان کے دیگر علاقوں کی تاریخ کے اوراق انگت اتار چڑھاؤ دیکھے۔ مختلف بیرونی حملہ آوروں کی یلغار کا سامنا کیا۔ جنگی گھوڑوں کی ٹاپیں سنیں، دودھاری تلواروں سے ٹپکتے خون کو جذب کیا۔ اپنوں کی باہمی کشمکش اور اغیار کی دراندازی کے طویل سفر دیکھا۔ زعما کی بلوچی دیوانوں میں قول واقرار کی محافل کا زینت بنا۔ عہد ووفا کے امینوں کے سر زمین کا لقب حاصل کیا۔ مہرومحبت کی داستانوں کا موجب بنا۔ قدیم بلوچی شاعری اور لوک کہانیوں کے آغاز بھی اس علاقے سے ہوا۔ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ سبی اور بلوچ قوم کی تاریخ کا ایک دوسرے سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔

" بلوچ قوم کی تاریخ کے متعلق یونانی، عرب، ایرانی، روسی، برطانوی و دیگر سیاحوں، مورخوں، تاریخ دانوں اور سرحدی افسران نے جس طرح اپنے پس پردہ عزائم کو مد نظر رکھتے ہوئے، بلوچ قوم اور بلوچستان کی تاریخ کے متعلق مختلف نظریات اور آراء پیش کرکے اسی سرزمین پر ہزارہا سال سے آباد مقامی قوم کو نووارد قرار دینے کی کوشش میں، بلوچ قوم کو مختلف حربوں اور زاویوں کے ذریعے نسلی امتیاز اور گروہی تقسیم کے ذریعے ان کے صدیوں سے قائم اتحاد واتفاق کے ماحول کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی ہے"۔(2) تاکہ ان کے اس دھرتی پر جمے قدموں کو کمزور بنا کر اپنی عزائم کی تکمیل خوش اسلوبی سے کرسکیں۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی نظر آئے کیونکہ ان سازشوں سے نہ صرف ان کے عزائم کی تکمیل ہوئی بلکہ صدیوں تک ہمارے مورخین بھی ان کی پیش کی ہوئی تاریخی بھول بھلیوں کا شکار رہے۔ لیکن حقائق کو پوشیدہ رکھنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ ان ہی کے نبشتوں میں اختلافات میں پوشیدہ حقائق چھپے رہے۔ اغیار کے پیش کئے گئے اختراع پر قائم تاریخ میں ان سے کئی سقم رہ گئے، جو کہ محققین اور مورخین کے لئے حقیقت کے اظہار کے تشنگی کا باعث بنیں۔ پھر قدرت نے ایک نیا موقع فراہم کیا۔ مہر گڑھ سمیت صوبے کے کونے کونے سے دریافت آثار قدیمہ اور ان کی باقیات کے متعلق بین الاقوامی ماہرین کی آراء، میڈیا اور انٹرنیٹ کی وجہ سے دنیا کا سمٹ کر نزدیک ہونے اور دنیا کے قدیم کتب خانوں تک آسان رسائی، مختلف زبانوں کی کتب کی تراجم نے ان کو نئے مواقع فراہم کئے، یوں نئے محققین اور مورخین کے لئے پوشیدہ راز عیاں ہونے لگے جو بلوچ

اور بلوچستان کی تاریخ پر صدیوں پر محیط اٹی ہوئی دھول کے ہٹنے کا باعث بن گئیں اور اصل حقائق آشکار ہونے لگی ہیں۔ ہم بھی آج سبی کی تاریخ پر اٹی دھول کو ہٹانے کی کوشش کریں گے۔ اس مقالے کا موضوع بحث تو سبی کے متعلق تاریخ کے اوراق سے دھول ہٹانے کی کوشش میں ہم تاریخ گزشتہ کے حادثات وواقعات کو مد نظر رکھتے ہوئے اصل حقائق تک پہنچنے کی کوشش میں علاقے کے جغرافیہ اور تاریخ کا جائزہ لیں گے جو تحریر کے طوالت کا سبب ضرور بنیں گی تاہم مفید معلومات کا پیش خیمہ بھی بنے گی۔

شِواستھان، سیوستان، شِوی اور شِوکوٹ کا ماجرا۔

شِواستھان، سیوستان، شِوی اور شِوکوٹ کے متعلق ہم یہاں اس لئے واضح ہونا چاہتے ہیں کہ ہمارے مورخین نے ان کے متعلق تاریخی حقائق اور واقعات کو بھی سبی کے تاریخ کے ساتھ جوڑ کر سبی کی اصلی حیثیت کے متعلق ابہام پیدا کیا ہے ۔سبی کے سندھ کے سرحدی علاقوں سے نزدیکی نے مورخین کو بھی تذبذب کا شکار کیا۔ جس کی وجہ سے انہوں نے سندھ اور پنجاب میں موجود شِواستھان، سیتستان، شِوی اور سوی میں رونما ہونے والے واقعات کو ایک دوسرے سے جوڑنے مواقع فراہم کئے ہیں جن کو واضح کرنا ضروری ہے۔

ڈاکٹر میمن عبدالحمید سندھی لکھتے ہیں کہ "رگوید سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم آریا پانچ اہم خاندانوں پر مشتمل تھا۔ "پنج جن (Five folk or five people)" لفظ رگوید میں کئی مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنیٰ ہیں پانچ آدمی۔ جس

میں پہلا ''پرؤ'' دوسرا ''آنوء'' تیسرا ''درہوٗ'' چوتھا ''پدؤء'' اور پانچواں ''نرسوٗ'' تھا۔ آرین میں سے کچھ اپنے نزدیکی دادا ''شوئ'' کے نام کی وجہ سے ''شِوی آریا'' کہلاتے تھے۔ رگوید کے زمانے میں پُرشنی (راوی) کے کنارے پر آباد تھے، وہیں پر پیدا ہوئے، رہے۔ اس لئے جگہ ان کے نام سے منسوب ''شِوپور (شوی۔ سبی)'' کہلاتا ہے۔ ڈاکٹر سمتھ لکھتے ہیں کہ ''ضلع جھنگ کا شور کوٹ سبی دارالحکومت تھا۔ بدھ دھرم کے مندر کے سے نکلے تانبے کے ایک بڑے برتن پر جڑے ہوئے تحریر جو کہ نسبتاً83ھ برابر402-3ع کی ہے ثابت ہوتا ہے اس شہر کا نام سبی (شِوپور) تھا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں ''سندھ میں سیوستان نامی شہر ہے جو کہ اصل شِیوا ستھان یعنی شِیو کا استھان۔ لیکن ان کے زبانی بگڑ کر سیوستان مشہور ہوا۔

وہ مزید لکھتے ہیں ''ہندو راج کے زمانے میں سندھ پانچ علاقوں پر مشتمل تھا جیسا کہ برہمن آباد، سیوستان، اسکلدہ، ملتان اور اروڑ۔ اروڑ پر راجا سیہرس بن ساہنسی رائے حکومت کرتا تھا۔ راجا کی جانب سے سیوستان پر حاکم نامزد تھا جو کہ سیوہن میں رہتا تھا۔ شیوا ستھان سندھی زبان میں لفظ شیوا ستھان سے بگڑ کر سیوستان اور شیووا نھنٹر سے سیوہن بنا۔ بعض کی رائے ہے کہ شور کوٹ سے سیوہن تک کا علاقہ شیوا ستھان کہلاتا تھا جو کہ بعد میں سکڑ کر سیوستان یا سیوہن تک محدود رہ گیا''۔ (3)

سندھ کے حکمران رائے سیہرس کے دور میں سیوستان کے حدود تاریخ سندھ میں بھی واضح لکھے گئے ہیں۔ اعجاز الحق قدوسی رقمطراز ہیں کہ ''اس صوبے میں بودھیہ (بودھی ممالک) جنکان، رونجھان اور کوہ پایہ سے لیکر سرحد مکران کا علاقہ

شامل تھا۔ پھر بدھیہ کے حدود کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ قدیم سندھ کا شمال مغربی صوبہ ہے جو کہ سیوستان یا سیوہن پرگنے کے متصل شمال میں واقع تھا اور موجودہ پورے ضلع لاڑکانہ اور ضلع جیکب آباد کے مغربی حصے پر مشتمل تھا۔ شمال مغرب میں کیکانان کا ترکی صوبہ اس سے ملحق تھا۔ چچ نامہ کے صفحہ 39 سے واضح ہوتا ہے کہ رائے خاندان کے زوال کے وقت صوبے کا پایہ تخت کاکاراج تھا۔ بعد کے حوالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قندابیل (گنداواہ) اس صوبے بدھیہ کا سرحدی شہر تھا۔ جس کی دوسری طرف کیکانان کا جنوبی علاقہ توران تھا۔ قندابیل عین سرحد پر تھا۔ چنانچہ اسے توران کے علاقوں میں شمار کیا جاتا تھا"۔(4)

مندرجہ بالا حقائق سے واضح ہوتا ہے اس سبی کا تعلق قدیم سندھ نہیں رہا ہے نہ ہی شِواستھان، شِوکوٹ یا سیوستان سے کوئی نزدیکی رہی ہے۔ ہمارے مورخین نے حقائق تک پہنچے بغیر ان علاقوں کے واقعات کو نادانستہ طور پر اس سبی کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ یہ سب حقیقت سے ناآشنائی کے سبب ہوا یا کوئی اور جہ، تاہم اس کی وجہ سے نہ صرف تاریخی ابہام پیدا ہوئے بلکہ سبی کی تاریخ کے بنیادی حقیقت کو پوشیدہ راز بتادیا۔

قلات سیوا اور سیوی شہزادی:

قلات سیوا کے متعلق مورخین کی رائے اور تاریخی حقائق اور واقعات میں بڑا واضح فرق نظر آتا ہے۔ راقم نے چھوٹی عمر میں بزرگوں سے روایت سنی تھی کہ قلات کے علاقے میں سیوا نامی ہندو خاندان کی حکومت تھا اور بادشاہ کی بیٹی کا نام

سیوی تھااور سبی اسی کے نام سے منسوب ہے۔ جب ہم نے تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں تو اس میں لاتعداد شکوک وشبہات جنم لیتے ہیں۔ جیسا کہ ''جنت السندھ'' کے مورخ مولائی شیدائی لکھتے ہیں کہ قلات کا قدیم نام ''قلات سیوا'' تھا جس پر سیوا خاندان کے راجا حکومت کرتے تھے۔ اسی خاندان کے راجہ سیہرس سے میر کمبر نے قلات فتح کر لیا اور پھر اس کا نام ''قلات بلوچ'' رکھ دیا۔ سیہرس کے بیٹے سنجن نے خوشی سے اسلام قبول کیا۔ جسے میر کمبر نے جھالاوان ریاست مرحمت کی۔ الفت نسیم لکھتے ہیں کہ ''بعض مورخین لکھتے ہیں کہ قلات پر میر کمبر رئیس کے قبضے کے وقت وہاں کسی سیوا راجہ کی حکومت تھی۔ جس کے ماتحت زہری کا علاقہ تھا۔ جہاں پر سنگین نامی بیٹا حکومت کرتا تھا۔ بعض نے سیوا خاندان کو ہندو خاندان کہا ہے۔ جن کا یہ سرکاری خطاب تھا۔ بعض نے سیوا کی نسبت سے سیوائی قبائل کی اصطلاح گھڑلی اور اسے کہیں سیوائی درآوڑ اور کہیں سیوانامی کو شانی خاندان کا نام دیا ہے وہ مزید لکھتے ہیں کہ لانگوؤں کا قدیم ترین طائفہ ''شانی'' کی روایت ہے کہ صحرائی یا سیرائی ان کے آباؤاجداد کا طائفہ رہا ہے جو قلات پر بالادستی رکھتے تھے۔ ان کا قدیمی علاقائی تعلق پنجگور کا موضع گچک رہا۔ ان کے ایک سردار یا حاکم کا نام راہو سیرائی رہا ہے''۔

ہندی لغت میں سیوا لفظ کے معنیٰ خدمت اور سیوی کے معنیٰ خدمتگار کے ہیں۔(5) موجودہ دور میں بھی امرتسر کے گوردوارے میں سیوا کی تربیت دی جاتی ہے۔ جہاں پر رضاکارانہ خدمت کی باقاعدہ دیجاتی ہے۔ جس میں گوردواروں کی صفائی اور مرمت، زائرین کی خدمت، کھانے پکانے وغیرہ کا کام اور یاتریوں کے

جوتوں کے جھاڑ پھونک کرنے کا عمل شامل ہے۔ اب اس سے واضح ہوتا ہے۔ سیوا کسی بادشاہ کا راجہ کا سرکاری خطاب کیسے ہوسکتا ہے۔ ہاں البتہ اگر سیوستان کے حاکموں کو سیوا حکمران کہا گیا ہے۔ اس کے متعلق اور سیوستان کے حدود کے متعلق ہم پہلے واضح ہوچکے ہیں کہ ان کا قلات سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔

الفت نسیم لکھتے ہیں کہ ”قلات کے روایتی تاریخ سے واقف ہندوؤں نے ہمیں بتایا کہ دراصل قلات بلوچ (قلعہ بلوچ) کا نام کبھی قلات سیوا نہیں رہا بلکہ سیوا مندر کی نسبت سے میری کا نام سیوا قلات مشہور ہوا جو کہ میری (قلعے) کے نیچے واقع ہے ان کے مہاراج نے بتایا کہ سیوا در حقیقت ہندوؤں کا قدیمی فرقہ رہا ہے جو سیوا بتوں کے پجاریوں نے پوری دنیا میں تبلیغ کی اور اس کے مندر بنوائے“۔(6)

متذکرہ بالا حقائق سے واضح ہوتا ہے میر کمبر رئیس کے قلات پر پہنچنے سے قبل یہاں پر بلوچ قبیلے رہائش پذیر تھے کیونکہ قلات کے قریب نیچارہ اور پندران میں اوائلی عہد سے آبادیاں چلی آرہی ہیں، جو کہ بلوچ قبائل کے نام سے منسوب ہیں جن کا ذکر ہمیں قدیم تاریخ سے ملتا ہے۔ دوسری طرف تاریخ کے اوراق واضح کرتے ہیں کہ رائے سیہرس اور رائے خاندان کی سندھ میں حکومت قبل از اسلام تا632ع تک کا عرصہ بنتا ہے۔ جن کے سلطنت کے حدود پہلے واضح ہوچکے ہیں، جبکہ میر کمبر رئیس کی قلات آمد کا وقت گیارہویں یا تیرہویں صدی عیسوی بنتا ہے۔

مورخین کی رائے کہ میر کمبر رئیس نے رائے سیہرس سے قلات لیا اس کا نہ تو تاریخی اوراق سے ربط ہے نہ ہی عہد کا تسلسل ہے۔ سرائیکی زبان کے متعلق

ماہرین کی ایک رائے ہے یہ یہ لفظ سرائی سے نکلا ہے۔ جب ہم سرائی لفظ جانتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ کاروان سرایا کاروان سری سے نکلا ہے۔ جس کے معنٰی فارسی زبان میں خان اور ترکمن میں حان کے ہیں اور حان کا لفظ آج بھی بلوچوں میں عزت کے طور پر نام کے ساتھ رائج ہے۔ اس صورتحال کی وجہ ہم واضح ہو جاتے ہیں کہ میر کمبر رئیس کی قلات آمد سے قبل یہاں پر کوئی سیوا راجہ یا سیوا ہندو بادشاہ کی حکومت نہیں تھی البتہ سری یعنی پہلے یا سِرائی بلوچ آباد تھے۔

رائے چچ کے سبی آمد کا تذکرہ:

ڈسٹرکٹ گزیٹیئر کے مطابق ''چچ ارمابیلہ (بیلہ) کے ذریعے جھالاوان سے قندابیل (گنداواہ) ہاتھ میں لیا اور اس کے بعد سنی اور سبی دریا تک پہنچا جو کہ آج ناڑی کے نام سے مشہور ہے ''۔ (7) جبکہ تاریخ سندھ میں اعجاز الحق قدوسی کے مطابق '' پھر وہ اپنی قائم کی ہوئی سرحد ارمابیل سے واپس لوٹا۔ توران کے علاقے سے ہوتا ہوا، وہ یورال ندی کے اوپر کے علاقے سے قندابیل پہنچا۔ چچ نے اس شہر پر دفعتاً حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر اس کے رہنے والے قلعہ بند ہو چکے تھے۔ وہ دریائے سنی کے کنارے خیمہ زن ہوا اور قلعے کا محاصرہ کیا۔ محصورین نے مجبور ہو کر سو خچر اور ایک لاکھ درہم خراج دینے کا وعدہ کیا اور ایک سال کا خراج پیشگی ادا کیا۔ اس معاہدے کی تکمیل کے بعد وہ اروڑ (الور) واپس ہوا ''۔ (8) اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ معاہدے تکمیل اور خراج لینے کے بعد سندھ روانہ ہو گیا۔ شاید گزیٹیئر کے مصنف نے دریائے سنی کے اوپر پڑاؤ ڈالنے کو سنی یا سبی سمجھ کر اپنا رائے دے ڈالا۔ لیکن

ایک حملہ آور قلعے کا محاصرہ کرنے بعد فتح کا انتظار کرنے کیلیئے اتنی دور جا کر کیوں پڑاؤ ڈالے گا۔ کیونکہ گنداواہ، سنی اور سبی کے درمیان کافی فاصلہ ہے۔اور کسی حملہ آور کے لئے ممکن ہی نہیں کہ وہ محاصرے کے بعد اتنی دور جا کر بیٹھ کر کامیابی حاصل کرے۔اب آتے ہیں دریائے سنی کے تذکرے کے جانب گنداواہ کے شمال کے جانب سوران کے آخری حدود میں سینہ واہ موضع آج بھی موجود ہے جس میں سکلیجی کا پانی آتا ہے پھر آگے چل کر اس میں دریائے بولان کا سیلابی ریلہ آگر تا جو گنداواہ کے شمال سے ہوتا ہوا مشرق سے گزر کر جنوب میں جھل کی طرف جاتا ہے۔ ممکن ہے اسی دریا کو تاریخ سندھ کے اوراق میں دریائے سنی لکھا گیا ہو جس کو ڈسٹرکٹ گزیٹیئر کے مصنف نے بغیر تحقیق اور حقائق پرکھنے کے سنی اور سبی قرار دیا۔

سمہ حکمران اور میر چاکر رند کی آمد

سندھ میں سمہ حکومت کا دور اقتدار 1351ع سے 1519ع تک کا عرصہ لکھا گیا ہے۔ سبی میں سمہ خاندان کے دسترس کے متعلق سردار خان گشکوری لکھتے ہیں کہ "1398ع میں ہندوستان پر امیر تیمور گورگان نے حملہ سے قبل وہاں پھیلی ہوئی افراتفری اور سرکشی اور عدم اعتماد کی فضا میں خانوادہ جام فتح خان نے ملتان کی بکھر سرکار پر تسلط جمالیا۔ جس کے ساتھ سیوی ایک ضلعے کے طور پر شامل تھا۔ پھر اسی سمہ حکمران کے خانوادے سے جام نظام الدین (ثانی) معروف جام نندہ سبی پر دسترس رکھتے تھے۔ واضح رہے کہ جام نندہ کا دور حکومت 1461ع سے 1503ع

تک کا عرصہ بنتا ہے۔ اسی کے دور حکومت میں رند ولاشار بلوچ کنفیڈریسی کی سبی اور کچھی میں آمد ہوتی ہے۔ یہاں پر تیس سالہ باہمی رسہ کشی بھی ہوئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے وہ پندرہویں صدی کے نصف کے بعد بلوچوں کی یہاں آمد ہوئی ہوگی"۔ (9)ڈاکٹر شاہ محمد مری رقمطراز ہیں "رند ولاشار بلوچ کنفیڈریسی کے مضبوط ستون تھے۔ میر شیہک کے تدبر اور بلوچ قوم کی بہادری نے جام نندہ (سمہ خاندان) سے کچھی کا علاقہ (سیوی سے کوہ سلیمان تک) اور دریائے حب تک کا سارا علاقہ فتح کرلیا"۔(10) میر گل خان نصیر یوں لکھتے ہیں۔ "رند ولاشار کئی سالوں تک میر چاکر اور میر گوہرام کی سرکردگی میں جام نندہ کے ساتھ کچھی کے میدانوں میں لڑتے رہے بالآخر جام نندہ کو مکمل شکست ہوئی۔ قبیلہ رند بارڑی، کرتہ، ڈھاڈر، سبی، بھاگ، سنی، سوران اور کچھی کے شمالی حصہ کو فتح کیا اور لاشاری قبیلہ نے کوٹڑو، گاجان، گنداواہ، جھل مگسی اور کچھی کے تمام جنوبی حصہ پر قبضہ جمالیا"۔(11)

سبی پر ملتان ودہلی کے حکمرانوں کی دسترس:

افغانستان پر مغل یا اصفحان کے حکمرانوں کی اجارہ داری ہو یا پھر احمد شاہ ابدالی کا دہلی تک دسترس ہو بلوچستان کی سرزمین راہ گزر کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے ان بیرونی حملہ آوروں نے یہاں پر مداخلت جاری رکھی۔ سبی اور کچھی میں قائم بلوچ کنفیڈریسی کے بعد رند اور لاشار قبائل میں تیس سالہ طویل باہمی کشمکش اور اس میں بیرونی مداخلت نے ان کو یہاں سے کوچ کرنے پر مجبور کردیا۔

لاشاری سندھ اور رند پنجاب کی طرف روانہ ہوئے۔ڈاکٹر شاہ محمد مری لکھتے ہیں ”میر چاکر اس تیس سالہ جنگ اور لاشاریوں کو تباہ کرنے کے چھ سال بعد 1512ع کے آغاز میں سبی سے ملتان چلا گیا اور سبی کے مشرق کی طرف چاکر کھور، چاکر میہاگ، چاکر بوس ناموں والی جگہیں اس کے سفر کی سنگ میل بن گئی“۔(12) اسی جنگ میں ذوالنون بیگ کی شمولیت نے سبی پر ان کے قبضے کی راہ ہموار کی، یوں ان کے بعد ارغون شاہ بیگ نے سبی پر قبضہ کیا۔1522ع میں اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے مرزاشاہ حسین نے یہاں کی عنان حکومت سلطان محمود بن میر فضل کو کلتاش کے حوالے کر دی۔ میر معصوم لکھتا ہے کہ سلطان محمود نے کئی قلعوں کو فتح کیا۔ جو عرصہ دراز سے بلوچوں کے پاس تھے۔ اس نے کوہستان کے ان مکینوں کو سختی سے دبا کر ان کو زیر نگین رکھا۔ تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ سلطان محمود کے زمانے میں مغل شہنشاہ نے اس کی جاگیر پر 1573 میں اس کی جاگیری پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

شہزادہ دارا کی آمد و گرفتاری:

شہزادہ دارا نے اورنگزیب کی ہندوستان پر قبضے کے بعد مزاحمت میں ناکامی کے بعد شمال کی جانب رخ کیا پھر سبی میں گرفتار ہو کر دوبارہ زندان کی نظر ہوا۔ جس کے بارے میں میر گل خان نصیر رقمطراز ہیں ”شاہجہان کے دور میں حاکم سبی جیئند خان باروزئی کے ظلم کے خلاف قوم مرزئی، طائفہ پنی کے چند آدمی شاہجہان کے حضور پیش ہوئے۔ شاہجہان کے حکم پر جیئند خان کو پابجولاں دہلی حاضر کیا گیا۔ جرم ثابت ہونے پر اسے ہاتھی کے پاؤں تلے روندنے کا حکم ہوا۔ دارا نے بیچ میں آکر اسے

معافی دلوائی۔ چند وقت کے بعد اورنگزیب نے غلبہ پاکر شاہجہان کو قید کرلیا۔ لڑائی ہوئی دارا کو شکست ہوئی۔ وہاں سے بھاگ نکلا۔ مختلف علاقوں میں بھٹکتا رہا تو اسے دوست کی یاد آئی۔ دارانے سوچا افغان سردار اس کا احسان مند ہے۔ اسے پناہ دے گا۔ دارا کے ہمعسر سیاح برنیر نے اس واقعے کو یوں بیان کیا۔ دارا کے گھر والوں نے اسے منع کیا اور افغان سردار پر اعتبار کرنے سے روکا۔ انہیں برے برے شگون نظر آئے اورانجام کے خیال سے تھرا اٹھے۔ دارا کے ارادوں سے ان کے بے اختیار آنسو نکل آئے۔ دارا کی کجرو عقل اسے بہالے گئی۔ وہ ان دلائل کے زور اور صداقت کو نہ سمجھ سکا اور کہتا گیا کہ یہ ممکن نہیں ہے جو شخص میرا اس قدر زیر بار احسان ہے، وہ مجھے دغا دے گا، وہ انسانی خیر کو خیر پر مبنی سمجھتا تھا۔ چنانچہ اسے اپنے اعتقاد کی زبردست قیمت ادا کرنی پڑی۔ جیئند خان باروزئی دارااور اس کے گھر والوں پر ٹوٹ پڑا۔ انہیں قید کرلیا اور خود لے جاکر اورنگزیب کے پاس دہلی پہنچایااور اورنگزیب نے اسے نواب بختیار خان کا خطاب دیکر انعام واکرام سے مالامال کردیا"۔(13)

سنڈیمن کی سبی آمد:

رابرٹ سنڈیمن کا نام تاریخ بلوچستان میں کئی مرتبہ آیا ہے اس افسر کا برطانوی دور میں بڑا اہم کردار رہاہے۔ برطانوی دور میں بلوچوں کے باہمی چپقلش کی وجہ سے برطانوی حکمرانوں کے مفادات کو نقصان کا اندیشہ ہونے لگا۔ تو اسے ذمہ داری دیا گیا کہ وہ ان معاملات کو بہتر بنائے۔ یوں رابرٹ سنڈیمن 8 دسمبر 1857 کے دن سبی پہنچا اس کے ساتھ انگریزی فوج اور رسالہ کا حفاظتی دستے کے علاوہ بلوچ

سردار۔ سردار امام بخش مزاری، سردار جمال خان لغاری، سردار غلام حیدر لنڈ، سردار سکندر خان کھوسہ، سردار گزین خان مری کا بھائی میر مہر اللہ خان مری، سردار شہباز خان بگٹی، سردار خان کھیتران اور سردار بابل خان بزدار ہمراہ تھے جو کہ بعد میں کوئٹہ و قلات کے جانب روانہ ہوئے۔

سِب، سبی اور سیوی:

سبی بلوچستان کا قدیم شہر ہے اور جیسا کہ بلوچ قبائلی معاشرت کی وجہ سے بلوچستان میں چھوٹے چھوٹے علاقوں میں آباد اتحادیوں نے مختلف علاقوں میں قومی تشخص اور جائے سکونت کے نام سے آبادیاں قائم کیں۔ سبی کا نام بھی اسی طرح پڑ گیا۔ سردار خان گشکوری لکھتے ہیں کہ "تاریخ اصطخری میں پہلی مرتبہ سیوی اور اس کے شاملات کا تذکرہ پاتے ہیں۔ سیوی کے ارد گرد کے علاقے کو عرب جغرافیہ دان بالص، بالش یا والشان کے ناموں سے جانتے ہیں۔ اصطخری کے مطابق مرکزی شہر سیوی یا سیواہ تھا۔ والی عام طور پر القصر (قلعہ) میں قیام کرتا تھا جو کہ اصفحانجے یا اصفانجوئی (زیارت کے مشرق واقع موجودہ قصبہ سنجاوی ہے) سے ایک لیگ کے فاصلے پر ایک چھوٹا قصبہ تھا۔ جس سے صحیح جائے وقوع معین نہیں کیا جاسکتا۔ مگر سیوی سے رخاجے کے سنجاوے کے راستے سفر کرتے وقت دو جگہوں پر ان کی سرحدیں ملتی ہیں"۔ آغا نصیر خان احمد زئی رقمطراز ہیں کہ "بلوچستان کے یہ شہر تاریخی حوالوں سے بہت پرانی ہیں۔ جن میں قلات، خضدار، گنداواہ، پنجگور، تربت، بیلہ، سونمیانی بندر، کوئٹہ، نوشکی اور سبی شامل ہیں۔ یہ شہر 2100ق م سے آباد چلے آرہے ہیں"۔(15)

جبکہ ڈاکٹر محمد اسماعیل البوشہری لکھتے ہیں کہ "ماد عہد میں آزاد یاک (ایشو وینو) کے دور حکومت میں بلوچستان کی ریاست سرزمین بارکان یا احباش سیوی کے نام سے قائم تھی اور یہ مشرقی شاتراب یعنی صوبے کا حصہ تھی"۔(16)

قلات سیوا اور سیوا خاندان کے متعلق ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں اب ہم جائزہ لیتے ہیں کہ سبی کا نام کیسے پڑا اور اس کو کس نے کیسے آباد کیا۔ بلوچوں کی ہزار ہا سال سے اس خطے میں موجودگی، طرز معاشرت یا پھر بیرونی یلغاروں کی وجہ سے اور باہمی کشمکش کی گردشوں کی وجہ ایک جگہ سے دوسرے جگہ طرف کوچ اور شہر آباد کرنا تاریخ کے اوراق کا حصہ ہیں۔ ایرانی بلوچستان کے صوبے کے سراوان ڈویژن میں اس وقت ایک ضلع سب وسوران کے نام سے موجودگی ملتا ہے۔ اسی ضلعے کے آبادیوں سے سب وسوران دو الگ الگ آبادیاں بتائی گئی ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسماعیل البوشہری لکھتے ہیں کہ "ضلع سب وسوران یہ سراوان ڈویژن کے مرکزی علاقے میں واقع ہے اور اس کا رقبہ 9262 مربع کلومیٹر ہے۔ اس کے شمال میں زاہدان کا علاقہ ہے۔ جنوب میں سراوان کا مرکزی ضلع اور مغرب میں میر جاوا واقع ہے۔ اسی کے ارد گرد 1500 ق م کا میل مارو کا ٹیلہ۔ 2000 ق م کا بیر کھوت یا بیر کھود کا ٹیلہ۔ 150 ق م کا کلہ برزاد کا ٹیلہ کے ساتھ ساتھ ابتدائی اسلامی دور سے تعلق رکھنے والا قلعہ سِب بھی واقع ہے۔ اس قلعے کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ قلعہ بلوچستان کی نہایت مستحکم اور مضبوط قلعوں میں سے ایک ہے اور سِب وسوران میں واقع ہے"۔(17) ناصر عسکری لکھتے ہیں کہ "سوران کے دیہات 72 آباد 18 غیر آباد ہیں، کل آبادی 9138 ہے باعتبار آبادی سب وسوران آبادیاں بالاترتیب 1733 اور 1887 افراد کی بستیاں ہیں۔ اے ڈبلیو ہیوز

لکھتے ہیں کہ ایرانی بلوچستان کے چار بڑے اضلاع ہیں لیکن کافی ہنوز نادریافتہ ہیں۔ ان کے مزید علاقوں کی تفصیل میں ضلع دزک کے سب ڈویژن کے نام یوں لکھتا ہے۔ دزک خاض، حبک، کالاگس، مگس، بام پشت، سب اور ارخشان ہیں جن کی آبادی= /30000 نفوذ بتاتا ہے"۔(18)

الفت نسیم لکھتے ہیں کہ "سبی کے ضمن میں شکارپور کے ایک جت خاندان جو کہ قدیم باشندے سبی کے رہے ہیں اپنی خاندانی روایات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ سبی نام کا تعلق سیوی یا سیوا وغیرہ سے نہیں بلکہ سبی کو آباد کرنے والے جت تھے جو ایرانی بلوچستان کے علاقہ سب سے ہجرت کر کے آئے تھے اور چوٹیالی کے اس مقام پر آباد ہو گئے تھے۔ یہاں وہ اپنے اصل وطن سب کی نسبت سے مشہور ہوئے یعنی سب کے رہنے والے۔ مزید لکھتے ہیں کہ "دی جاٹ آف پاکستان از ڈاکٹر سگرڈ سیسٹ، فل، ہیلبش اینڈ ڈاکٹر، ہینسر وسیٹ فل، بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیئر اور ہسٹری آف جٹس از ڈینزل ابیسٹین وغیرہ نے جت قبائل کو جٹ اور جاٹ قبائل سے الگ تسلیم کرتے ہیں اور انہیں بلوچ نسل کے (اونٹ پالنے والے پیشہ ور گروہ) تسلیم کرتے ہیں"۔(19)

اب دیکھتے ہیں لفظ سب نے سبی اور پھر سیوی کا سفر کیسے طے کیا۔ سب سے سبی کا ذکر تو اوپر آیا ہے اب ہم سیوی کا ذکر کریں گے۔ بولان کے پہاڑیوں سے لیکر کوہ سلیمان کے چوٹیوں اور دامنوں میں صدیوں سے آباد بلوچوں کے زبان کو بلوچی کا مشرقی لہجہ کہا جاتا ہے۔ بلوچی زبان کے مشرقی لہجے میں "ب" کی جگہ "و" کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے "سوب" کی جگہ "سوّو" نواب کی جگہ "نواو" حراب کی جگہ "حراو"

حبر کی جگہ ''ہوّر'' واب کی جگہ ''واوّ''کا استعمال ہوتا آرہاہے۔ مشرقی لہجے کی تلفظ کی وجہ سے سبی کو سیوی کہا گیا۔ اسی سیوی کی وجہ سے ہمارے مورخین نے ہمسایے میں آباد منظم اقوام کی تاریخ میں استعمال شیوا، سیوستان اور شوی کوئی فرق نکالنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے واقعات کو ایک دوسرے سے جوڑ کر سبی کی اصل حقیقت کو مسخ کر دیا۔

مقدمہ:

بُرزاا عظم خان اِنت جہلا تا کیچ ءِ کمبر اِنت

ڈھاڈرءِ میران، ماں نلی سندھ ءِ عومر اِنت

بیلوءِ عالی ہوت، سیوی ءِ چاکر اِنت

یعنی مکران کے بالائی علاقوں میں اعظم خان اور زیریں علاقوں تاسرحد کیچ میر کمبر کا اقتدار تھا۔ ڈھاڈر (کچھی) میں میران رند اور نلی (سندھ) موجودہ (نصیر آباد) میں میر عومر نوہانی حاکم تھے، جبکہ بیلہ میر عالی (ہوت) بہ مشہور (عالی جام) اور سبی میں چاکر رند کے اقتدار کا دبدبہ ہے۔ بلوچی کے اس قدیم شعر میں ان کی قدیم طرز معاشرت اور مختلف علاقوں میں قائم ہونے والے چھوٹے چھوتے اتحادیے کی تحت زندگی کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ چونکہ اتحادیے ان کے منظم ہمسایہ اقوام نظر میں کھٹکتی رہی ہیں جس کی بناپر انہوں نے ہر وقت موقع تلاش کرکے نہ صرف ان کے اتحادیے کو پارہ پارہ کیا بلکہ ان کو اپنے عزائم کی تکمیل کیلئے استعمال بھی کیا۔ فارس، افغانستان، سندھ اور ہند پر انہی کے دست بازو بن کر دہلی کے تخت تک پہنچایا۔ شاہ محمد مری لکھتے

ہیں کہ "بابر پنجاب روانہ ہوا تو دیبال پور کے مقام پر دولت خان لودھی جو بلوچوں کے پناہ میں تھا بابر سے مل گیا۔ بابر نے سیوی واپس بلوچوں کے حوالے کردی، بلوچوں کی حمایت لینے کی تگ ودو بابر سے لیکر آج تک ہر حکمران کی مجبوری رہی ہے"۔(20) لیکن ہم یہ کہنے پر حق بجانب ہونگے کہ بابر سے پہلے بھی ایرانی، عرب ودیگر حکمرانوں نے بھی ان کی حمایت حاصل کی ہے۔ بحیرہ حزر سے بحر بلوچ تک ہزارہا سال سے آباد قوم نے جب بھی غیروں کی مداخلت کی جکڑ کمزور محسوس کی تو بڑے اتحادیے کی شکل میں نمودار ہوئے جس میں میر کمبر رئیس، میر میرو میروانی، میر چاکر رند، میر نصیر خان نوری اور خان بلوچ کے نام کے اتحادیئے تاریخ کے اوراق میں واضح نظر آتے ہیں۔

قدیم بلوچی شاعری سے لیکر جدید شاعری، لوک کہانیوں، لوگ گیتوں، رزمیہ شاعری، عشقیہ شاعری، تاریخی واقعات میں سبی کا ذکر ہمیں بلوچوں کی سبی سے والہانہ عقیدت کا اظہار دکھاتا ہے۔ اب ایسی صورتحال میں کوئی یہ کہے کہ یہ سب کردار افسانوی ہیں تو پھر ہمیں بلوچوں صدیوں پر ادبی تشخص سے انکار کرنا پڑے گا۔ اگر کسی ایک کہانی ایک شعر میں ذکر ہو تو اس پر شک کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن سینکڑوں کتب، تحقیقی مواد اور پھر کوہ سلیمان کی چوٹیوں سے لیکر پہاڑی دامنوں، میدانوں، چراگاہوں، دیوانوں سے ہوتے ہوئے ایرانی بلوچستان اور زابل کی وادیوں تک لوگوں کی زبان عام سے نکلنے والی ان نادر موتیوں کو کس طرح جھٹلایا جاسکتا ہے جو ہمیں بتلاتی ہیں کہ سبی کی سرزمین اور بلوچوں کی تاریخ کس طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس مضمون میں ہم نے تاریخی واقعات اردگرد

کے جغرافیائی حدود، قلات سیوا، شِواستھان، سیوستان،شِوی ،شِوکوٹ، سیوہن کے وجود کی چھان بین بھی کی۔ تاریخ سندھ اور تاریخ ہند کے اوراق بھی دیکھے۔ تاریخ بلوچستان کے متعلق مختلف مورخوں کی کتابیں بھی چھان لیں اور تاریخ بلوچ کے متعلق کتب کا جائزہ بھی لیا۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ جغرافیائی طور پر انتہائی اہم جگہ پر قائم بلوچ سرزمین ابتدائی ادوار سے مختلف عالمی اور علاقائی طاقتوروں کے نظر میں رہاہے۔ان ہی کے مورخوں سیاحوں، سرحدی افسران نے نہ صرف حقائق کو مسخ کرکے ہمارے اتحادیے کوپارہ پارہ کیابلکہ اپنے پس پردہ عزائم کی تکمیل کیلئے ہمیں بطور ڈھال بھی استعمال کیاہے۔

زمانہ قدیم یعنی2100ق م میں سبی کا تذکرہ یامادعہد میں آزاد پاک مشرقی شاتراب یاصوبہ کانام بارکان یااحباش سیوی کاہونااورایرانی بلوچستان کے موجودہ ڈویژن سراوان کے ضلع سِب وسوران میں سب وسوران نامی الگ الگ قدیم آبادیوں کی موجودگی، قدیم سب قلعہ اور اس کے ارد گرد2000ق م کی آثار قدیمہ کی دریافت اسی طرح یہاں پر سراوان ،سبی اور سوران کی قدر مشترک، یہاں پر قلعہ کی موجودگی،ارد گرد آثار قدیمہ کی دریافت، پھر یہاں پر بسنے والی اقوام کاایران میں مگس اور یہاں پر مگسی، بلیدہ سے بلیدئی، دشت سے دشتی،لاشار سے لاشاری وغیرہ اس کی تصدیق کرتاہے کہ سبی بلوچوں کاقدیم سے قدیم شہر ہے جس کوسب ایران سے آنے والے بلوچوں نے آباد کیا۔ان کے یہاں سے آباد ہونے سے سبی ہواپھر مشرقی لہجے کی تلفظ کی ادائیگی میں ''ب'' کی جگہ ''وَ'' کے استعمال سے سبی سے سیوی ہوا۔

حوالہ جات:

1۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر۔ سبی۔

2۔فاروق بلوچ۔بلوچ اور انکا وطن۔ فکشن ہاؤس لاہور۔2012

3۔ڈاکٹر میمن عبدالحمید سندھی۔سندھ جے تاریخ جاو کھریل ورق۔مہران اکیڈمی۔1994

4۔اعجازالحق قدوسی۔ تاریخ سندھ۔اردو سائنس بورڈ۔لاہور۔2004

5۔راجیور راؤ/ اصغر۔ہندی لغت۔ سچیت کتاب گھر۔لاہور۔2003

6۔الفت نسیم۔چند تاریخی گوشے۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔2008

7۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر۔ سبی ڈائریکٹریٹ آف آرکائیوز۔بلوچستان۔کوئٹہ۔2004

8۔اعجازالحق قدوسی۔ایضاً

9۔سردار خان گشکوری۔ترجمہ غفار ندیم۔چاکر اعظم۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔1967

10۔ڈاکٹر شاہ محمد مری۔بلوچ عہد قدیم سے عصرِ جدید تک۔ تخلیقات لاہور۔1998

11۔ لانگ ورتھ ڈیمز۔ترجمہ وتالیف ۔میر گل خان نصیر۔کوچ وبلوچ۔ سیلز وسروسز کوئٹہ۔1998

12۔ڈاکٹر شاہ محمد مری۔ایضاً

13۔میر گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان۔قلات پبلشرز۔کوئٹہ۔2010

14۔ سردار خان گشکوری۔ ایضاً

15۔ آغا نصیر خان احمد زئی۔ بلوچی دنیا۔ مضمون۔ بلوچی دنیا ملتان۔ اکتوبر 2005

16۔ بلوچ تاریخ اور عرب تہذیب۔ڈاکٹر محمد اسماعیل البوشہری۔ترجمہ محمد صادق بلوچ۔ آزات جمالدینی اکیڈمی۔ کراچی 2008

17۔ایضاً۔

18۔ناصر عسکری۔ ترجمہ غوث بخش صابر۔ سیستان و بلوچستان۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔1996

19۔ سرزمین بلوچ۔اے ڈبلیو ہیوز ترجمہ پروفیسر انور رومان۔ گوشہ ادب کوئٹہ۔ 2011

20۔ڈاکٹر شاہ محمد مری۔1990۔ ایضاً

میری کلات۔ بلوچ مرکزیت کا قدیم نشان

کلات بلوچی زبان میں قلعے کو کہتے ہیں یہ وہ عمارت ہوتا ہے، جہاں پر حاکم، سربراہ، خان، امیر اور قوم کے سربراہان رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ کلات کے علاوہ اس عمارت کو میری، ماڑی اور کوٹ بھی کہاجاتا ہے۔ جب ہم بلوچ سرزمین پر آباد بلوچ قوم کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں ایسے لاتعداد قلعوں کا ذکر ملتاہے، جو ہمیں بلوچوں کے چھوٹے بڑے مرکزیت کے دوران سربراہان کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ جیسے کہ سبی میں چاکر کا کلات جس میں سولہویں صدی کے دوران رند ولاشار مرکزیت کا نشان نظر آتا ہے، اسی طرح کیچ میری جس کو پنوں کا کلات بھی کہاجاتا ہے، ہوت دور کی علامت ہے، ایران کے صوبے سیستان وبلوچستان میں بمپور کا کلات جو کبھی بلوچوں کا پایہ تخت رہاہے۔ ایران میں چابہار کا کلات جہاں پر میر حمل جیئند نے حکمرانی کی، ایران میں ایران شہر کا کلات جو میر دوست محمد کے دور میں دارالحکومت رہا۔ خیرپور سندھ میں میر سہراب خان ٹالپور کا کوٹ ڈیجی کا کلات اور ان ہی کا (پاکستان وبھارت کے سرحدی علاقے میں) امام گڑھ کا کلات، کوئٹہ میری جسکو کوٹ بھی کہاجاتا ہے، (بزرگ بتاتے ہیں کہ پرانے دور میں میری کی وجہ سے سریاب کے حدود کے شمالی علاقے کو کوٹ اور جنوبی علاقے کو شال کہاجاتا تھا)۔ اسی طرح ایران کے ضلع سب وسوران میں سب کلات، خاران کلات کے علاوہ سندھ، پنجاب، بلوچستان، ایران اور افغانستان کے بلوچ آبادی والے علاقوں میں دیگر

لاتعداد کلات، میری ،ماڑی،اور کوٹ کے نام سے قلعے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ سینکڑوں دمب(ٹیلے) بھی موجود ہیں جو ان علاقوں میں بلوچ قبائلی سربراہان اور والیان حکومت عظیم نشانیاں کہلاتی ہیں، لیکن ہمارا موضوع بحث وہ کلات ہے جو آخری بلوچ فرمانرواؤں کی نشانی کے طور پر یاد کیاجاتا ہے جس کو مورخین نے میری کلات، سیوا کلات اور کلات نیچارہ کے نام سے تاریخ کے اوراق کا زینت بنایا ہے، جو کہ اس وقت تقریباًملیامیٹ ہونے کے قریب ہے۔

کلات بلوچ قوم کیلئے آزادانہ تشخص کا نشان اور بلوچ تاریخ میں درخشاں باب کی حیثیت رکھتا ہے، جس پر صدیوں سیوائی پانچ سو سال تک اکراد بلوچ، سیوائی بلوچ، رئیس بلوچ، میرواڑی بلوچ، رند بلوچ اور پھر تقریباً تین صدیوں تک احمد زئی خاندان کے چشم وچراغوں نے جاہ وجلال کے ساتھ حکمرانی کی، جن میں میر سمندر خان احمد زئی بلوچ نے "امیر الامرا" میر عبداللہ خان نے "پہاڑی عقاب" میر نصیر خان احمد زئی بلوچ نے "نوری نصیر خان" کا خطاب پایا اور میر محراب خان احمد زئی بلوچ نے انگریزوں کے مردانہ وار مقابلہ کرکے حریت کے کارنامے سرانجام دیئے۔

جدید تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ میر احمد خان (اول) قمبر اڑی بلوچ نے 1666ء سے 1667ء میر محراب خان (اول)احمد زئی بلوچ نے 1695ء سے 1696ء تک، میر سمندر خان احمد زئی بلوچ نے 1697ء سے 1713ء تک، میر احمد خان (دوئم) احمد زئی بلوچ نے 1713ء سے 1714ء، میر عبداللہ خان احمد زئی بلوچ نے 1715ء سے 1730ء تک، میر محبت خان احمد زئی بلوچ نے 1730ء

سے1749ء تک، میر نصیر خان احمد زئی بلوچ " المعروف نوری نصیر خان " نے1749ء سے 1794 تک، میر محمود خان(اول) احمد زئی بلوچ نے1794ء سے 1831ء تک،میر محراب خان (دوئم) احمد زئی بلوچ نے 1831ء سے1839ء تک،میر شاہنواز خان احمد زئی بلوچ1840ء سے1857 ء تک،میر نصیر خان(دوئم) احمد زئی بلوچ نے مئی1857ء سے مارچ1863ء تک،میر شیر دل خان احمد زئی بلوچ نے مئی1863ء سے 1864ء تک میر خداداد خان احمد زئی بلوچ نے (دوبارہ) نومبر1863ء سے نومبر1931ء تک، میر محمود خان(دوئم) احمد زئی بلوچ نے نومبر1931ء سے1933ء تک،جبکہ میر احمد یار خان احمد زئی بلوچ نے ستمبر1933ء سے تاالحاق پاکستان کلات پر حکمرانی کی۔ واضح رہے کہ 27مارچ1948ء کو ریاست کلات نے پاکستان کے ساتھ الحاق کیا۔ تاہم3،اکتوبر1952ء کو مکران، لسبیلہ، خاران اور ریاستِ کلات نے ملکر بلوچستان اسٹیٹس یونین بنایا جس کا سربراہ خان اعظم ریاستِ کلات کا حاکم تھا۔جن کا پاکستان کے ساتھ باضابطہ الحاق 4،اکتوبر1955ء کو ہوا۔" (1)

میر احمد یار خان بلوچ آخری فرمانرواکلات اپنی کتاب، "تاریخ بلوچ وخوانین بلوچ" میں میر احمد خان سے قبل کلاتِ پر میر حسن خان میرواڑی بلوچ، میر بجار میر واڑی بلوچ، میر مندو رند بلوچ، میر عمر خان میر واڑی اور سردار میرو خان میر واڑی کو بالترتیب کلات کے حکمران لکھتے ہیں "۔(2) جبکہ میر نصیر خان احمد زئی اپنے کتاب "تاریخ بلوچ و بلوچستان" میں کلات پر854 قبل مسیح سے 550 قبل مسیح

تک میر کیکان اوّل (جسکو میر میران کالقب حاصل تھا) کردنے 854ق م سے 803 ق م تک، امیر زوراک (میر میران) نے 803 ق م سے 750 تک، امیر وشاب نے 751 ق م سے 710 ق م تک، امیر ذگرین 710 ق م سے 675 ق م تک، امیر زیبار نے 675 ق م سے 638 ق م تک، امیر براخم، 638 ق م سے 594 ق م تک، امیر گوران 594 ق م سے 550 ق م، امیر اُرشان 550 ق م سے 519 ق م تک، امیر زوراک (دوئم) نے 519 ق م سے 485 ق م تک، امیر ارجان نے 485 ق م سے 460 ق م تک، امیر شاموز 460 ق م سے 424 ق م، امیر براخم (دوئم) نے 424 ق م سے 400 ق م تک، امیر سابول نے 400 ق م تا 370 ق م، امیر نورگان نے 370 ق م سے 350 ق م تک، امیر کیانوش نے 350 م ق سے 338 ق م تک اور امیر کیکان دوئم نے 338 ق م سے 330 ق م تک کلات پر کرد حکمرانوں کا ذکر کرتے ہیں۔ خلیفہ حضرت علیؓ (656ع تا 660ع) اور بنی امیہ خاندان کے پہلے خلیفہ امیر معاویہ (640ع تا 680) کے خلافت میں قدیم بلوچستان کے دو خطے توران (سطح مرتفع کلات) اور مکران میں کرد بلوچوں کی قبائلی انتظامیہ کے کونسل کے یہ امرا تھے"۔ (3)

1۔ امیر مردان براخوئی۔ 2۔ امیر خلف زنگنہ۔ 3۔ امیر آلاک اورگانی۔ 4۔ امیر تاکول مالی۔ 5۔ امیر آکول کرمانی۔ (4)

اس کے بعد 171 ق م سے 124 ق م تک، امیر بہرام براخوئی، 124 ق م سے 88 ق م تک امیر شاہداد براخوئی 88 ق م سے 69 ق م تک امیر بہرام

براخوئی،69 ق م سے 55 ق م تک امیر مہرداد،55 ق م سے 25 ق م تک امیر بہمن،25ق م سے 1ق م تک، امیر بسام، 1ع سے 12ع تک، امیر خفی،12ع سے 78 ع تک امیر شاوش78 ع سے 128 ع تک امیر مردان،128ع سے 162 ع تک، امیر شاہ میر،162ع سے 182ع تک، امیر بیغ،182ع سے 227ع تک، امیر شاہ 227ع سے 240ع تک، امیر براک،240ع سے 272ع تک، امیر مہران،272 ع سے 301ع تک، امیر شادان، 301 ع سے 309 ع تک، امیر رستم،309ع سے 379ع تک، امیر سلم، 379 ع سے399 ع تک، امیر سیامک،399ع سے 420ع تک، امیر منگیب،420ع سے 457ع تک، امیر شاہ برز،457 ع سے 483ع تک، امیر کوشان،483ع سے 501ع تک، امیر رشان، 501ع سے 531ع تک، امیر کیاسر، 531ع سے 579ع تک، امیر بہرام،579ع سے 590ع تک، امیر بیدار کی حکمرانی کا ذکر ملتا ہے۔ اسی 590 ع کے بعد613 ع تک ،امیر بشام،613ع سے 628ع تک، امیر جادبر،628ع سے 644ع تک، امیر جان بیگ،466 ع سے 680ع تک، امیر مہرداد،680ع سے 688 ع تک، امیر مردان،688ع سے 715 ع تک، امیر اسد،715ع سے 743ع تک، امیر نوذر،743ع سے 750ع تک، امیر ایرج،750ع سے 869ع تک، امیر موسیٰ،869ع سے 892ع تک، امیر عمر،892ع سے 908ع تک، امیر سعد،908ع سے 945 ع تک، امیر براخم، 945ع سے 974ع تک، 991ع تک امیر بہرام، 991ع سے 1031ع تک امیر رستم۔

اسی طرح 1245ع تک۔ یہاں پر امرائے کونسل اکراد بلوچ کی یہاں پر موجودگی کا ذکر ملتا ہے۔ تاہم ان کی توران پر حکمرانی کے متعلق تاریخ کے اوراق خاموش دکھائی دیتے ہیں۔(5)

پھر یہاں پر سیوا خاندان کے قبضے کا ذکر آتا ہے، سنان بن سلمہ کے ساتھ سیوا زوراک اور اس کے بیٹے سنگین کے مڈبھیڑ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ لیکن مورخین طبری، بلاذری، قاضی اظہر مبارکپوری، اعجاز الحق قدوسی، ڈاکٹر محمد اسحٰق بھٹی، شاہد حسین رزاقی، اور ڈاکٹر عبدالرحمن براہوئی، اپنی اپنی تصانیف میں عرب حکمران راشد بن عمرو بن قیس عبدی الآزدی اور سنان بن سلمہ کے ساتھ میدوں کے مڈبھیڑ کا ذکر کرتے ہیں"۔(6) کوردگال نامک میں شہادت حسین کے بعد اکراد بلوچ توران ومکران (قدیم بلوچستان) نے سوگ منایا، جن اکراد بلوچ قبائل نے ماتم میں حصہ لیا ان میں...

1۔براخوئی۔2۔ادرگانی۔3۔زنگنہ۔4۔سنجاوی۔5۔ ماملی۔6۔ کرمانی۔ 7سباہی۔ 8۔بازیجانی۔9۔سفاری۔10۔سنجانی۔11۔سورانی۔12۔شاری۔13۔ شاماری۔14۔سُریانی۔15۔بابنی۔16۔آسکانی۔17۔توکانی۔18۔جلابک۔ 19۔صلاحی۔20۔ شینوانی۔21۔جاوی۔22۔گرُجینی۔23۔ہوتکاری۔24۔ شکانی۔25۔نداملی۔26۔شوون۔27، مجارانی۔28۔مرّائی۔29۔کشانی۔ 30۔شمبد۔31۔کِدک۔32۔خاوری۔33۔دینوری۔34۔جسفانی۔35۔سویانی

36۔ حسرانی۔37۔ دیگانی۔38۔ گوجاری۔39۔ شاہولی۔40۔ شنبانی۔41۔ اتیت
ری۔42۔ شاہکی۔43۔ بیوانی۔44۔ سارونی۔45۔ سمدینی۔46۔ الزاری۔
47۔ جسکانی۔48۔ کربانی۔49۔ بوزیری۔50۔ جلوانی۔51۔ سلاری۔52۔ ہوتانی
۔53۔ ساہتک۔54۔ روہیلی۔55۔ شولانی۔56۔ بوتانی۔57۔ ترحانی۔58۔ جیان
ی۔59۔ باجانی۔60۔ باہو۔61۔ تیغانی۔62۔ شَملُو۔63۔ رودینی۔64۔
جلاّب۔65۔ شحل۔66۔ شابیکی۔67۔ تیہو۔68۔ ساوانی۔69۔ بادینی۔70۔
مسِکانی۔71۔ آدینی۔72۔ ہیجب۔73۔ یلانی۔74۔ جیندی۔75۔ ڈرکی۔
76۔ شیکبانی۔77۔ شامیری۔78۔ تورانی۔79۔ جیکانی۔80۔ کیکانی۔81۔
بیزن۔82۔ جلائی۔83۔ زرینی۔84۔ سمالی۔85۔ تشکری۔86۔ شاہکی۔87۔
سنجری۔88۔ سوجانی۔89۔ شمبوانی۔90۔ بجیری۔91۔ کودانی۔92۔ توہو۔
93۔ زیرکی۔94۔ بورکی۔95۔ ہوتمانی۔96۔ ہمدانی۔97۔ حادی۔98۔ عبدانی ۔
99۔ بُجوری۔100۔ تیلگی۔101۔ شورانی102۔ نودو۔103۔ سَنگر۔104۔ شیفا
ک۔105۔ زیروی۔106۔ کرتک۔107۔ کوچانی۔108۔
زرکانی۔109۔ جونگل۔110۔ ڈرّاک۔111۔ بمبکانی۔112۔ کورانی۔
113۔ سیوائی۔114۔ شیلک۔115۔ مُجار۔116۔ زرنان شامل ہیں۔(8)

پھر وہ لکھتے ہیں کہ 1295ع سے 1304ع تک گزن، اس کے بعد اس کے بھائی اُلجیئے تو حکمران بنتے ہیں، جو1316ع تک حاکم ہوتے ہیں، اس کے بعد امیر کمبر میروانی براخوئی بلوچ کی مسند نشینی جو1440ع سے 1460ع تک ہوتی ہے، اس

کے 1485ع سے 1512ع تک رند بلوچوں کی حکمرانی کا ذکر کرتے ہیں۔ دوبارہ میروانی بلوچوں کی حکمرانی شروع ہوتی ہے، امیر ذگر میروانی 1530ع سے 1538ع تک، امیر حسن کمبرانی بلوچ1549ع سے 1560ع تک، امیر ملوک کمبرانی 1581ع سے 1590ع تک، امیر سوری کمبرانی 1610ع سے 1618ع تک کے حکمرانوں کا ذکر کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ بلوچ تاریخ کے مورخین میروانی بلوچوں سے قبل سے میر کمبر رئیس کو کلات کے حکمران ہونے کا ذکر کرتے ہیں "۔ (9)مذکورہ بالا حوالہ جات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گزین سے قبل کلات کا حاکم رہے ہونگے۔ اسی دوران کلات سیوا یا سیوا خاندان کا ذکر بھی آتا ہے۔

متشرقین ودیگر مورخین نے کلاتِ سیوا کا ذکر کیا تو محققین نے اس سیوا کی جڑیں توران سے ملحقہ سندھ کے ہندو حکمران رائے خاندان (جن کو سیوا بھی کہا جاتا ہے) کے راجدھانی سیوستان سے جوڑنے کی بھرپور کوشش کرکے اصل حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مندرجہ بالا حقائق کے مطابق 854ق م سے 590ع تک میدوں کی مدد سے کردوں نے کلات اور ملحقہ علاقوں پر حکمرانی کی ہے، پھر 590ع سے 1245ع تک یہاں پر اکراد بلوچ کے کونسل کے پنجگانہ کا ذکر ملتا ہے اور 1295ع سے گزن حکمران بنتے ہیں۔ پھر تا الحاق پاکستان بلوچ ہی اس ریاست کے حکمران بنتے رہے ہیں۔ سندھ جس کو رائے خاندان کے دور حکومت میں سیوستان بھی کہا جاتا تھا، جو شیوا استھان یعنی شیو کے رہنے کی جگہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جن کی اقتدار قبل از اسلام یعنی 622 عیسوی کو سندھ میں ختم ہوتی ہے، اس کے

بعد تاریخ کے اوراق میں بلوچستان کے ملحقہ علاقوں میں سیوا نامی کسی حکمران کے آثار بھی نہیں ملتے جن لڑیاں متشرقین کے اس دعویٰ کو سچ میں تبدیل کر سکیں۔ ملک سعید احمد دھوار لکھتے ہیں، "یہ معلوم نہیں کہ وہ کونسا سیاسی وسماجی پس منظر تھا جس کی بنیاد پر ایک ہندو خاندان کو عہد وسطیٰ میں کلات میں اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے کا موقع ملا"۔ اسی طرح راورٹی بھی بحث کرتے ہیں، "عربوں کے فتح کے بعد کوئی تاریخ یاشہادت کا کوئی معمولی نشان موجود نہیں جس کی روسے یہ ظاہر ہوسکے کہ کسی بھی ہندو مملکت کا اسلامی علاقے کے کسی حصے میں وجود تھا"۔(10)

اب آتے ہیں، کلات بلوچ کے قدیم نام کی طرف، نامور مورخ میر نصیر خان احمد زئی لکھتے ہیں، "براخوئی اکراد کے توران پہ قبضہ کے بعد 854ق م میں امیر کیکان نے بحیثیت حکمران مسند توران پر جلوس کیا، سب سے جس اہم مسئلہ پر اس نے توجہ دی، وہ آٹھ براخوئی طائفوں پر ملک کی تقسیم کا مسئلہ تھا، جسے اس نے براخوئی اکراد کے آٹھ طائفوں پر تقسیم کیا۔ توران ملک کو تین حصوں میں تقسیم کیا، خطہ شمالی ،خطہ وسطی، خطہ جنوبی ،خطہ شمالی طائفہ گورانی وکیکانی کو دیا گیا جو اس دور میں "بنجیران" کے نام سے موسوم تھا۔ یہ شہادت واضح کرتی ہے کہ میدین دور 854ق م میں مید کردوں کے امیر کیکان کے کلات کے میر میران (حاکم) بننے سے قبل یہ شہر وعلاقہ "بنجیران" کے نام سے مشہور تھااوران کے حکمران بننے کے بعد اس کا نام کیکان پڑگیا۔ واضح رہے کہ بلوچ قبائل میں بوجیران، بوژیران اور بوہیران نام رکھا جاتاہے، جو کہ اسی بنجیران کا تسلسل ہے، اس کے علاوہ سندھ کے علاقے سیوہن سے

لیکر جام شوروتک کے درمیانی علاقے کے پہاڑی سلسلوں میں قدیم بلوچوں کا طائفہ بوجیری آباد ہے، جو آج تک بلوچی زبان بولتے ہیں۔ جبکہ کورد گال نامک میں امام حسینؓ کے شہادت پر جن اکراد بلوچ طائفوں نے سوگ میں حصہ لیا ان میں بجوری، بجیری اور بوزیری طائفوں کا ذکر ملتا ہے۔ آئینِ اکبری کے مورخ ابوالفضل نے بھی "اس علاقے کا نام کلاتِ نیچارہ لکھا ہے"۔(11) الفت نسیم بھی اس کو کلاتِ نیچارہ کا نام دیتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق یہ بتاتے ہیں کہ نیچارہ اور پندران یہاں کے قدیم قصبے ہیں۔(12) ڈاکٹر شاہ محمد مری لکھتے ہیں، "نیچارہ اور پندران کے علاقہ میں کئی کئی پہاڑوں، چٹانوں اور قبرستانوں میں زرتشتی آثار موجود ہیں"۔(13)

راورٹی بھی لکھتے ہیں کہ کلاتِ بلوچ کا نام حاصل کرنے سے قبل اس قلعے کا نام کلاتِ نیچارہ تھا(14) اسی طرح ڈسٹرکٹ گزیٹیئر کے مورخ بتاتے ہیں کہ "نیچارہ جھالاوان کا قدیم گاؤں ہے جہاں پر ایک کلات تھا" واضح رہے کہ آج بھی نیچاری براہوئی زبان بولنے والوں بلوچوں کا ایک نامور طائفہ ہے۔ تاریخ کے اوراق یہ بھی بتاتے ہیں کہ جب چچ نے سندھ میں حکمرانی کی بھاگ دوڑ اپنے ہاتھ میں لی اور پنجگور تک کے علاقے کو قبضہ کیا تو اس نے توران اور کندابیل پر حملہ کرکے ان کے باسیوں سے خراج وصول کرنے کا وعدہ لیکر اپنے وطن عازمِ سفر ہوئے، اب اگر مورخین اس واقعات کو بنیاد بناکر ان علاقوں کو سندھ کا حصہ قرار دیتے ہیں تو یہ تاریخی غلطی ہوگی کیونکہ سندھ کے کلہوڑہ حکمران بھی کچھ عرصہ کلاتِ بلوچ کے احمدزئی خاندان کے حکمرانوں کے باجگذار رہے ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق یہ واضح کرتے ہیں، کلاتِ بلوچ پر احمد زئی خاندان کے چشم چراغوں کے حکمرانی سے قبل یہاں پر مید، کرد، نیچاری، سرائی یا سیوائی، میر واڑی اور رند بلوچوں کی حکمرانی رہی ہے۔ہاں یہ البتہ ماننے کی بات ہو سکتی ہے کہ بلوچوں کے چھوٹے بڑے اتحادیوں اور مرکزیت کی کمزوری کی وجہ سے یہ علاقہ کسی زور آور کے زیر اثر رہا ہو گا، لیکن یہ 854ق م سے قیام پاکستان تک وہ بلوچوں کا مرکز رہاہے۔ مستشرقین کا یہ دعویٰ کہ یہ کلات سیوا تھا، یاہندو سیوا خاندان کے زیر اثر رہاہے انتہائی غلط ہے، جس طرح انہوں نے بلوچ قوم کے تاریخ کو مسخ کرکے اپنے مقاصد کی تکمیل کی اسی طرح وہ بلوچوں کے مرکزیت کے متعلق بھی من گھڑت خیالات کو فروغ دیتے رہے۔ مندرجہ بالا شہادتوں سے بہت سی قباحتیں واضع ہوئی ہیں، تاہم اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے، تاکہ تاریخ کے اوراق پر جمی دھول کو مکمل طور پر ہٹایا جاسکے۔

حوالہ جات:

1۔میر نصیر خان احمد زئی۔1988۔تاریخ بلوچ وبلوچستان (جلد اول)بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

2۔میر احمد یار خان۔2007۔تاریخ بلوچ وخوانین بلوچ العصر پبلی کیشنز۔لاہور

3۔ایضاً۔۔۔1996۔ایضاً۔۔۔(جلد دوئم)ایضاً

4۔ایضاً۔۔۔1998۔ایضاً۔۔۔(جلد سوئم)ایضاً

5۔ایضاً۔۔۔1993۔ایضاً۔۔۔(جلد چہارم)ایضاً

6۔ڈاکٹر عبد الرحمن براہوئی۔بلوچستان میں عرب فتوحات۔قلات پبلشرز کوئٹہ

7۔اخوند صالح محمد۔1994۔کورد گال نامک۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

8۔ایضاً۔۔۔1994۔ایضاً۔۔۔(جلد پنجم)ایضاً

9۔ملک سعید دہوار۔تاریخ بلوچستان۔۔۔۔

10۔میر گل خان نصیر 1998۔کوچ و بلوچ۔سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ

11۔ابوالفضل۔آئین اکبری۔۔۔

12۔الفت نسیم۔2008۔چند تاریخی گوشے۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

13۔ڈاکٹر شاہ محمد مری۔2016۔بلوچ قوم مہر گڑھ سے تشکیل یات تک۔سٹی بک پوائنٹ کراچی

14۔راورٹی۔1888۔نوٹس آن افغانستان اینڈ پارٹس آف بلوچستان۔آئرے سپاٹس ووڈے لندن

بلوچستان کی قدیم بندر گاہیں

بلوچستان کی سرزمین زمانہ قدیم سے سیاسی، سماجی، دفاعی اور جغرافیائی اعتبار سے انتہائی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ اوائلی دور میں سلک راہ گذر (Silk Route) کے ذریعے مغربی ممالک، وسطی ایشیا، ہند، چین سے روس تک کی منڈیوں میں پہنچنے کا عمل ہو یا پھر روس، وسطی ایشیا، چین اور ہند کے پیداوار کو مغربی دنیا اور علاقوں تک پہنچانے کی جدوجہد بلوچستان کی سرزمین راہ گزر کے طور پر استعمال ہوتی چلی آرہی ہے۔ اسی طرح سمندری راستے کے ذریعے یمن، شام، مصر، افریقہ، گجرات، مالابار، جزائر شرق الہند اور چین کی منڈیوں تک ایسی مصنوعات پہنچانے کا عمل میں بلوچستان کی بنادر (بندر گاہیں) کلیدی کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ گزشتہ دو صدیوں کے دوران بین الاقوامی قوتوں کی اقتصادی اور نظریاتی جنگ ہو یا دور جدید میں دنیا کے سرمایہ داروں کو گوادر کا شغر اقتصادی راہداری یعنی جدید سلک راہ گزر(New Silk Route) کے ایک حصے کے ذریعے اپنا کاروبار کو دنیا بھر میں توسیع دینے کا خواب، بلوچستان کے بنادر کی اہمیت ہزارہا سالوں کے طویل سفر کے بعد جدید دور میں کلیدی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔

جس زمانے میں مصر میں ممفص (Memphis)اور تھیبس (Thebs) شام میں ٹائرے(Tyre) جزیدہ میں بابل ونینوا، فارس میں اصطخری (Persepdis) نامی شہر کاروباری اعتبار سے عروج پر تھے۔ ان کی بحری تجارت بحیرہ حذر، خلیج فارس، قلزم اور بحر ہند کے راستوں سے ہوا کرتی تھی۔ ان متمدن اقوام کی تجارت مکران

کے بنادر سے جڑی ہوئی تھی۔ اس خطے کی پیداوار اوران کے مصنوعات کی منڈیوں تک رسائی کے لئے یہ بندرگاہیں مرکزی اہمیت کے حامل رہی ہیں۔ ان بحری راستوں پر قزاقوں کے حملے بھی ہوا کرتے تھے جس کی سرکوبی کے لئے مصری، یونانی، بابلی دیگر مکران کے بندرگاہوں تک حملے کیا کرتے تھے۔ پندرہویں صدی میں جب پرتگیزی قزاق بحری تجارت کو نقصان پہنچارہے تھے تاجروں کو لوٹ رہے تھے تو بلوچستان کے ساحلی علاقے کلمت کے سردار حمل جیئند نے پرتگیزیوں سے بحری تجارت کو محفوظ رکھنے کے لئے اقدامات کئے۔ متعدد بار پرتگیزیوں سے مقابلہ کرکے انہیں علاقے سے باہر کیا۔ ایک معرکے میں پرتگیزی انہیں گرفتار کرکے لے گئے۔ اس بہادر سپوت کی جانب سے سمندری تجارت کو محفوظ بنانے کے قربانیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فرنگیوں نے "گوا" کے قومی عجائب گھر میں اس مورتی سجائی، مکران کے بنادرے تاریخی اعتبار سے کئی انقلابات دیکھ چکی ہیں۔ ان بنادر میں جیوڑی، گوادر، راس شامل، پسنی، کلمت، اور سونمیانی قابل ذکر ہیں۔

بلوچستان کے ان بنادرسے وسطی ایشیا، بمبئی، سندھ اور دیگر علاقوں کو اشیا درامد اور برآمد کی جاتی رہی ہیں۔ بلوچستان سے متعدد اشیا باہر کی منڈیوں تک بھیجی جاتی رہی ہیں۔ اے ڈبلیو، ہیوز، (A.W.Huges) نے بلوچستان کے بنادر انیسویں صدی کے آٹھویں دہائی کے ابتدائی پانچ سالوں کے دوران درآمدات اور برآمدات کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

نمبر شمار	سال	بر آمدات	درآمدات
1	1870-71	358443.00	260237.00
2	1871-72	397575.00	177351.00
3	1872-73	261079.00	221990.00
4	1873-75	248923.00	213478.00
5	1874-75	30976.00	171268.00

مذکورہ بالا اعداد وشمار انیسویں صدی میں(1) بلوچستان کے بنادر سے بر آمدات اور درآمدات واضح کرتے ہیں یہ بنادر تجارت کے اعتبار سے کتنی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔اگر ان بنادرے تجارت یونہی جاری رہتا تو آج صورتحال کیا ہوتی؟ ساحلی علاقوں کے لوگ آج بنیادی سہولتوں سے محروم نہ ہوتے۔روزگار کے لئے دیگر شہروں اور ملکوں کارخ نہ کرتے۔ آیئے چند اہم بنادر کے بارے میں جانتے ہیں۔

سونمیانی:

سونمیانی کراچی سے پچیس میل دور اور عرج بلد24-25شمال اور طول بلد66-25مشرق اور بیلہ سے جنوب میں واقع ہے۔یورپی سیاحوں ہنیری پوٹینگر،چارلس میسن اور ڈی ونڈٹ سمیت مختلف سرحدی افسران نے اپنے سفرناموں اور روزناچوں میں اس بندرگاہ کاتذکرہ کیاہے۔اے ڈبلیو ہیوز کے مطابق

1840 سے قبل جام میر عالی کے دور حکومت میں سالینہ مالیا،40,000.00 سے زائد بتایا گیا جو زیادہ تر سونمیانی سے حاصل ہوتا تھا۔ بحری افسر ٹی جی کارلیس نے 1869 میں لکھا ہے کہ یہ کھاڑی دریائے پورالی نے تشکیل دی ہے۔ یہ ایک باقائدہ کھاڑی جو کراچی کی کھاڑی کی طرح وسیع دلدلوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ جبکہ پوٹینگر کے خیال کے مطابق خلیج سونمیانی کے جنوبی حصہ میں وہ بندر گاہ واقع تھی جس کو سکندر اعظم کے بحری امیر نیر کس نے "سکندریہ" کا نام دیا۔ جہاں بقول ایرئین اس کا بیڑہ کافی وقت کھڑا رہا۔ ایرئین نے اس کا نام کرکولہ لکھا۔ (2)

قدیم زمانے میں سونمیانی وسط ایشیائی ملکوں کی تجارتی بندر گاہ تھی۔ سندھ اور بلوچستان پر قبضہ کرنے سے قبل فرنگیوں نے 1840 میں اس کی تجارتی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے یہاں پر اپنا ایجنٹ مقرر کیا۔ یہ وہ بندر گاہ رہا ہے جہاں سے قلات اور شال کے راستے وسطی ایشیا کا تجارتی مال پہنچتا تھا۔ پھر یہاں سے دساور جاتا تھا انگریزوں کے بعد درہ بولان ریلوے لائن تعمیر ہونے کی وجہ سے مال کراچی بندر گاہ کے راستے دساور جانے لگا یوں سونمیانی بندر کی اہمیت ختم ہوگئی۔

اورماڑہ:

اورماڑہ کی اہمیت بھی زمانہ قدیم سے اب تک بہت زیادہ رہا ہے۔ دریائے ہنگول کے مغرب میں عرض بلد25-12 شمال اور طول بلد64-45 مشرق میں واقع ہے۔ یونانی جغرافیہ دانوں نے اورماڑہ کے علاقے کو پارکنوئی(Parknoi)اور

بندر گاہ کو باجیسرا کے نام سے یاد کیا ہے۔ ہیروڈوٹس نے اس علاقے میں پاریکانی نامی قوم کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ ہم زمانہ قدیم کے جغرافیائی نقشوں پر نظر ڈالتے ہیں تو پاریکانی یاہر کانیہ نامی وسیع علاقے کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ یہاں کے قدیم باشندے ''مید''ہیں۔ جنہیں کچھ مورخین نے قزاق بھی لکھا ہے۔ واضح رہے کہ جن بحری قزاقوں کے لوٹ مار کی داستان سن کر محمد بن قاسم یہاں پر حملہ آورہوئے تھے انہیں بھی مورخین ''مید''لکھتے ہیں۔

اس علاقے کے بحری قزاقوں نے سکندر مقدونی کے خلاف بھی کارروائیاں کی ہیں اورماڑہ کافی عرصہ لسبیلہ کے جام حکمرانوں کے ماتحت رہا ہے، اے ڈبلیو ہیوز لکھتے ہیں ۔اسے خان قلات نے سابق والی لسبیلہ کو مکران میں نمایاں خدمات کے عوض میں دے دی تھی۔ کپتان راس جس دور میں اورماڑہ آئے تھے اس وقت یہاں کی آبادی ایک ہزار اور اس کی سالانہ آمدنی چھ ہزار روپے تھی۔ یہاں سے مسقط، بمبی، مالابار اور کراچی تجارت ہوا کرتی تھی۔ 1945 کے زلزلے میں یہاں پر بہت نقصان ہوا تھا موجودہ دور میں اورماڑہ میں ملک کی اہم نیول بیس موجود ہے۔

کلمت:

کلمت ساحل مکران کی قدیم بندر گاہ کہلاتی ہے۔ جس کو یونانی مورخ ایرئین (Arrian)نے کلما (Kalma) لکھا ہے۔اے ڈبلیو ہیوز کے مطابق 1903 میں لارڈ کرزن نے مکران کی بندر گاہ پسنی کے انتظامات کو درست کرنے کے غرض سے اس

بندر گاہ کا دورہ کیا۔ یہ ہندوستان کا پہلا انگریز وائسر ائے تھا جس نے مکران کے ساحلی بندر گاہ کا دورہ کیا۔ کراچی سے سو میل کے فاصلے پر واقع یہ کھاڑی امبر ندی سے لے کر اورماڑہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کھاڑی کے علاوہ کلمت میں چار اور کھاڑیاں بھی موجود ہیں جن میں جعفری، چھلی، شاہری، شپ اور مار کولہ کہتے ہیں۔

مورخین کے مطابق کلمت کھاڑی میں ایک خاص قسم کی سیپ پائی جاتی تھی جس سے بہترین قسم کا چونا بنایا جاتا تھا کسی زمانے میں بحرین کی طرح یہاں سے بھی بیش قیمت موتی نکالے جاتے تھے۔ قدیم زمانہ میں سلطنت میدیا کی اہم بندر گاہ تھی۔ سکندر مقدونی نے ہند سے واپسی کے دوران یہاں پر قیام کیا تھا۔ اس کے سپہ سالار نیر کس اس بندر گاہ کو محفوظ سمجھ کر یہاں پر لنگر انداز ہوئے۔ پر تگیزیوں کے خلاف کارروائیاں کر کے بحری تجارت کو محفوظ رکھنے پر اپنا سر قربان کرنے والے حمل وجیئند کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔

پسنی:

کراچی سے 192 میل کے فاصلے پر پسنی بندر واقع ہے اسے کسی دور میں ریاست قلات کا بہترین اور خوبصورت بندر گاہ کہا جاتا تھا۔ مولائی شیدائی لکھتے ہیں۔ اس کا جنوبی حصہ جبل زرین کہلاتا ہے۔ پسنی شہر کے نزدیک مشرق کی جانب راس البحری واقع ہے۔ جو سطح سمندر سے ایک پچاس فٹ بلند ہے جہاں پر شادی کور (ندی) سمندر میں گرتی ہے۔ وہاں پر ریتلی زمین ہے۔ پسنی ساحل پر سو گز کے فاصلے پر تقریباً ایک ہزار کشتیاں آکر لنگر انداز ہوتی ہیں، موسمی ہواؤں کے چلنے کے دوران

یہ کشتیاں مچھلی کا شکار نہیں کرتی ہیں۔

1905 میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی جہازوں نے پسنی بندر گاہ پر آنا شروع کیا جس سے تجارت کو فروغ ہوا۔ اسی سال کسٹم کی آمدنی اٹھارہ ہزار ہوئی۔1906 میں کسٹم کی آمدنی باسٹھ ہزار ہوئی اور ایک لاکھ روپے مالیت کا مال دساور بھیجا گیا۔1933 میں خان میر اعظم خان، خان قلات کے دور میں پسنی کے تجارتی روابط جاپان سے قائم ہوئے۔1945 میں شدید زلزلے میں اسے بہت نقصان پہنچا۔ موجودہ دور میں یہاں پر ''فش ہاربر''موجود ہے۔

گوادر:

گوادر جسے گُوادر، گواتر، گوات در، گوادیل جیسے ناموں سے لکھا گیا ہے۔ کراچی سے 258 میل دور مغرب کی جانب ایک خاکنائے پر واقع ہے۔ مولائی شیدائی لکھتے ہیں '' اس خاکنائے کا مشرق سے مغرب تک سات میل ہے اور عرض ڈیڑھ میل ہے۔ گوادر شہر کے سامنے خلیج گوادر ہے۔ خاکنائے گوادر میں جب قدرتی ہوائیں چلتی ہیں تو جہاز خطرہ کے باعث اس ساحل سے ایک سو گز کے فاصلے پر آکر لنگر انداز ہوتے ہیں یہ بندر گاہ جزیرہ نما کے مانند ہے''۔(3)

1783 میں مسقط کے حکمران شہزادہ بھائی سے ناراض ہو کر / جھگڑہ کر کے بلوچستان آئے میر نصیر خان کے دربار میں پیش ہو کر مدعا بیان کیا۔ جس کو اعزاز کے ساتھ مہمان رکھا گیا۔ بعد میں میر جہانگیر نوشیروانی کی استدعا پر خان اعظم نے گوادر بندرگاہ اس شہزادے کے نان ونفقے کے لئے عطا کی۔ جس کو بعد میں مسقط کے

حکمرانوں نے اپنے قلمرو میں شامل کیا جس کو ستمبر 1958 میں دوبارہ پاکستان نے خرید کر بلوچستان کا حصہ بنایا۔

موجودہ دور میں دنیا کے اقتصادی راہداریوں کو نزدیک کرنے کے لئے گوادر کی اہمیت انتہائی اہم ہوگیا۔ گوادر کا شغرا اقتصادی راہداری کی تعمیر کے باعث دنیا کی نظریں گوادر پر ہیں۔ کیونکہ دنیا کے سرمایہ دار اس بندرگاہ پر قابض ہو کر دنیائے تجارت پر اپنا سکہ جمانے کی تگ ودو میں ہیں۔

پسنی بندر کے جبل زیریں سے 23 میل جنوب میں کراچی سے 220 میل دور راس شامل نامی چھوٹے بندر کا تذکرہ بھی ملتا ہے اس کے علاوہ کراچی سے 290 میل دور پاکستان اور ایران کا سرحدی جیوڑی (جیونی) بندر موجود ہے۔ بلوچستان کے ان بنادر کی اہمیت ہزار سال سے قائم ودائم ہے۔ ان بنادر کو فعال بنا کر دنیائے تجارت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی جاسکتی ہے۔

چابہار بندر:

ایران کے جنوب مشرق میں واقع چابہار بندر بلوچ تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل بندر کہلاتی ہے۔ سکندر اعظم کے دور میں لگ بھگ 2500ق م میں اسے (Tiz) تیز کے نام سے جانا جاتا تھا۔ البیرونی نے بھی اس بندر کا تذکرہ کیا ہے۔ تاریخی اوراق کے مطابق پرتگیزی یہاں پر 1621 عیسوی تک موجود رہے پھر علاقے میں برطانوی اثرورسوخ کا تذکرہ ملتا ہے۔ جدید چابہار کی بنیاد ایرانی شاہ رضا شاہ پہلوی نے رکھی۔ ایرانی انقلاب کے بعد اس کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ ایران عراق جنگ

کے دوران اہم بندر کی شکل اختیار کر گیا۔چابہار بندر کو دو حصوں شاہد کلانتری (Shaid Kalantri)اور شاہد بہشتی (Shaid Behashti)جو150 فٹ کے چار اور 492 فٹ چار کھاڑیوں پر مشتمل ہے۔اسے موجودہ صورتحال میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ شمال جنوب کے درمیان خصوصاً روس، یوکرین، ترکی، اومان، شام، انڈیااور وسطی ایشیائی ممالک کے درمیان تجارت میں نقل وحمل کلیدی کردار ادا کررہاہے۔ اس کے علاوہ اسے انڈیا،ایران اور افغانستان کے درمیان تجارت کا مرکز بنایاجارہاہے۔ یہاں پر انڈیا کے ساتھ ساتھ چین اور جاپان بھی سرمایہ کاری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

حوالہ جات:

1۔اے ڈبلیو ہیوز (مترجم انور رومان) سرزمین بلوچ، گوشہ ادب کوئٹہ

2۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر۔ لسبیلہ

3۔ مولائی شیدائی۔1994۔ سرزمین بلوچ۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

4۔ سلیم خان گمی،1990۔ بلوچی ادب و بلوچ ثقافت مطبوعات النسا۔ کوئٹہ

5۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر۔ مکران

6۔میر احمد یار خان۔1975۔ان سائیڈ بلوچستان،رائل بک کمپنی۔ کراچی

بلوچستان کے قدیم غاریں

غار زمین، پہاڑ اور سمندر کے اندر ارضیاتی عمل کے بعد قدرتی طور پر بننے والی پناہ گاہ (کھو کھلی جگہ) کو کہتے ہیں۔ غار کو بلوچی زبان میں ''ہوڈ'' کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ زمانہ قدیم میں انسانوں نے قدرتی آفات اور موسمی حالات اور جنگلی جانوروں سے محفوظ رہنے کے لئے بھی عارضی پناہ گاہیں بنائی ہیں۔ جہاں پر داخل ہونے کے لئے راستہ موجود ہوتا ہے۔ غاروں کے قدرتی تشکیل و ترقی کے عمل کو کیفیات (Speleogy) کے علم کے مطابق جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ زمانہ قدیم میں انسان ایک جگہ رہ نہیں سکتے تھے۔ غذا کی تلاش اور قدرتی آفات سے بچنے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے ہیں۔ اس دوران وہ موسمی اثرات اور جنگلی حیات سے تحفظ کی خاطر قدرتی غاروں اور پہاڑوں کی چوٹی پر قیام گاہیں / پناہ گاہیں قائم کرتے رہے ہیں۔ ان قدیم پناہ گاہوں سے قدیم انسانی تہذیب کے آثار دریافت ہوئے ہیں۔ جن کو بنیاد بنا کر ماہرین انسانی تہذیب کے سفر کا پیمانہ بیان کرتے ہیں۔ محققین کے مطابق انسانوں کے قدیم رکاز (پتھر بنی ہڈیاں) جنوبی افریقہ کے موکوپوا اور کروگزڈراپ نامی غاروں سے دریافت ہوئی ہیں، وہیں ہی سے مختلف غاروں سے تیس لاکھ سال قدیم انسانی تہذیب کی شہادتیں بھی ملی ہیں۔

بلوچستان میں بشریات، ارضیات اور آثاریاتی شعبوں میں کوئی قابل ذکر کام نہیں ہو سکا ہے۔ صوبے کے وسیع و عریض رقبے پر پھیلے پہاڑی سلسلوں میں

انگنت غار ملتے ہیں۔ یہ غاریں انسانی تہذیب اور تمدن کے قدامت کے عظمت کے نشان ہیں۔ کیونکہ ان غاروں میں زمانہ قدیم میں انسانوں نے زندگی گزار کر ہمارے لئے انگنت تاریخی یادیں چھوڑی ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ تاریخ سے بے خبر، حال سے لاتعلق اور مستقبل کے لئے بے فکر! نہ یہاں سے ملنے والے رکاز پر تحقیق، نہ آثار قدیمہ کے باقیات کوڈی کوڈ کیا گیا اور نہ ہی غاروں کی جانچ پرکھ ہوئی! جس دن ان پر تحقیقی کام ہوا تو تہذیب کے انگنت پہلوؤں واضح ہوں گے۔ طاہر عدیم کہتے ہیں۔

اسے بھی پردہ تہذیب کو گرانا ہے

مجھے بھی پیکر نایاب سے نکلنا ہے

بلوچستان کے مختلف علاقوں میں چند غاروں کی تفصیل اور ان کی قدامت کو دیکھ کر آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں ان پر صرف ابتدائی معلومات سے تشنگی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوسکا ہے۔

پندران

قلات کے علاقے پندران میں پندران گاو ئں سے چوتھائی میل کے فاصلے پر جدید پتھر کے زمانے (یعنی چالیس ہزار قبل مسیح سے دس ہزار قبل مسیح تک) کا غار ہے۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر جھالاوان کے مطابق "لیفٹیننٹ ای میکلوڈ (E.Mackload) نے 1902 میں یہاں کا دورہ کیا اور دیکھا کہ غار کے بڑے کمرے کی چوڑائی 18 فٹ اور لمبائی 12 فٹ ہے۔اس کے ساتھ ملحق دو کمرے (Chambers) ہیں۔ ایسے لگ رہا ہے یہ غار ایک گول پہاڑی کو تراش کر بنایا گیا ہو، یہ غار انسانی ہاتھوں کی بنی ہوئی ہیں

یہاں سے انسانی کھوپڑیاں ملی ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں سے ایک بڑے کتے کا ڈھانچہ ملا ہے اسی جگہ سے بیس گز کے فاصلے پر ایک اور غار بھی موجود ہے جہاں پر ایک خاتون کی کھوپڑی ملی۔ مقامی لوگوں کے مطابق زمانہ قدیم میں یہاں پر کوئی جنگ لگی تھی۔" (1)

شہر روغان

لسبیلہ شہر سے 9 میل شمال میں پہاڑی سلسلے اور پورالی ندی کے نزدیک پہاڑی سلسلے پر کھودے گئے غار موجود ہیں۔ "جنہیں1838 میں نیوی کے ایک کمانڈر ٹی جی کارلیس (T.G-Carless) نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دریافت کیا۔ وہ پورالی نہر کے مغربی حصے میں گہری کھائی کے سلسلے سے گزرتے ہوئے کھڑی ڈھلوانوں سے گزر کر درختوں کے جُھنڈ کے راستے وہاں پر پہنچے "۔(2) ان کے غاروں کے بارے میں فاروق بلوچ لکھتے ہیں۔

" مٹی اور ریت کے ان پتھریلے پہاڑوں میں ایک ہزار سے زیادہ نمایاں غار پائے جاتے ہیں۔ جو انسانی کاوشوں کے نتیجے میں بنے ہیں اور مکمل کمرہ نما غار ہیں ہر کمرے کے سامنے وسیع بالکونی بنی ہوئی ہے۔ اسی بالکونی کے اندر سے باقی کمروں میں جانے کے راستے ہیں بعض کمروں میں اندر کی جانب مزید کمرے بنے ہوئے ہیں "۔(3)

یہ غار عموماً15 فٹ کے کمرے پر مبنی ہیں۔ کمرے کے شمال کی جانب جھروکے بنے ہوئے ہیں جن میں دیا جلا کر روشنی کا انتظام کیا جاتا تھا۔ کمرے کے آگے ایک کھلا برآمدہ ہوتا تھا۔ بڑے کمرے کے ساتھ ایک چھوٹا کمرہ بھی ہوتا تھا جو

غلّہ کے گودام کے طور پر استعمال ہوا تھا۔

ان غاروں کے متعلق مختلف روایتیں موجود ہیں۔ یہاں پر ایک قبر موجود ہے جس کو مائی پیر، مائی بلوچانی، مائی کولاچی اور نانی پیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ زیارت مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے یکساں طور پر مقدس ہے کیونکہ دونوں اس کو اپنے طور پر اپنے مذہب کی نشانی مانتے ہیں۔ تاہم میں اس کی وجہ سے دونوں کے درمیان کو جھگڑا کبھی نہیں ہوا۔ کوئی ان غاروں کو شہزادی بدیع الجمال سے منسوب کرتا ہے، تو کوئی اسے بدھ بھکشوؤں کا چلّہ گاہ قرار دیتا ہے تو کوئی اسے سکندر اعظم کا بسا ہوا شہر قرار دیتا ہے، لیکن جب ان پر سائنسی انداز میں کام ہو گا تو پھر سچائی سامنے آئے گی تاہم آثار قدیمہ کے ماہرین انہیں سکندر اعظم کے دور اور بدھ ازم سے قدیم قرار دیتے ہیں۔

لاہوت:

سلسلہ کوہ پب جو خضدار کے جنوب سے شروع ہوتا ہے۔ منگھو پیر کراچی کے قریب ساحل تک جاتا ہے۔ یونین کونسل شاہ بلاول نورانی ضلع خضدار کے قریب پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے۔ اس کے اندر پتھر کے مختلف اشکال میں ڈھلی اشیا کو مسلمان عقیدتاً حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ کے استعمال کی اشیاء گردانتے ہیں۔ جبکہ غوث بخش صابر لکھتے ہیں۔

”غار کے اندرونی آثار سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں پر ماتما بدھ کی مورتی رکھی گئی تھی جو اب ٹوٹ کر شکستہ ہو چکی ہے اس کے نقوش مٹ

چکے ہیں۔ غار کی چھت چٹان ہے جو تراشیدہ تین ستونوں پر قائم ہے جن میں درمیانی ستون چھت سے کچھ نیچے ٹوٹ چکا ہے۔ غار کے اندر چٹان سے تراشا ہوا ایک حوض ہے، جس میں چھت سے پانی ٹپکتا ہے۔ جو برف کی طرح ٹھنڈا ہے"۔(4)

غار کے متعلق روایت مشہور ہے کہ یہ سرنگ ہے جو عربستان تک چلی جاتی ہے جس کے بارے میں محمود نظامانی لکھتے ہیں۔

" یہی سرنگ ہے جو مکہ تک جاتی ہے۔ اگر آدمی اس راستے تک مکہ جاتا چاہے تو تین دن میں وہاں پہنچ سکتا ہے۔ ہمارے بزرگان دین اور ولی اللہ تمام اسی راستے سے جاتے تھے لیکن اب اس سرنگ سے کوئی آدمی جانہیں سکتا کیونکہ اب یہ سرنگی راستہ بند کردیا گیا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے ہمارے پنجتن پاک اسی سرنگ کے راستے مدینہ سے لاہوت آیا جایا کرتے تھے"۔(5)

میر علی شیر قانع ٹھٹھوی اس غار کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "اس کمرے کے اندر ایک غار ہے جس سے راستہ بنا ہوا ہے اور اس کی کوئی انتہا یا حد نہیں۔ کہتے ہیں کہ اس راستے سے ڈھائی دن کے عرصے میں حجاز کی سرزمین تک پہنچا جا سکتا ہے۔ آج کل یہ راستہ بند ہے۔ قدیم زمانے میں درویشوں نے اس راستے کی سیر کی ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں۔ اس کمرے میں ایک طشتری نما پتھر بھی رکھا ہوا ہے۔ روایت ہے کہ زمانہ قدیم میں اللہ کے چالیس برگزیدہ فقیروں نے اس میں تل کا ایک دانہ پیس کر شکم سیر ہو کر کھایا تھا"۔(6)

جبکہ مسلمان عقیدت مند بتاتے ہیں غار کے اندر ایک پتھر کا شیر ہے جس پر حضرت علیؓ سواری فرماتے تھے۔ ایک اونٹنی ہے ایک نورانی چشمہ ہے۔ ایک چکی

ہے اور ایک صابن ہے جو کہ حضرت بی بی فاطمہؓ کے زیر استعمال رہی ہیں۔

غار کے باہر ایک پہاڑی ہے جس کو مسلمان کہتے ہیں یہ قیامت کا کھمبہ ہے جس کے بارے میں بدر ابڑو لکھتے ہیں۔

" قیامت کے کھمبے کے بارے میں فقیر بتاتے ہیں کہ جس دن یہ قدرتی کھمبہ غار کی چھت سے ٹکرائے گا اس دن قیامت آجائے گی۔ بتاتے ہیں یہ درخت کی طرح آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے اسی کھمبے کے بارے میں اگر پنڈتوں سے پوچھا جائے وہ اسے "سویم بھولنگم" کہتے ہیں"۔(7)

اس غار کے باہر فقیر ہر وقت آگ جلاتے رکھتے ہیں۔ یہاں پر مذہبی اعتبار سے زرتشت، بدھ ازم، ہندو ازم اور مسلمانوں کے عقائد کے نشانات ایک ہی وقت میں نظر آتے ہیں۔

ایری کلگ کا غار

خاران کے علاقے ایرکلگ میں ایک منفرد غار موجود ہے جس کے بارے میں غوث بخش صابر لکھتے ہیں۔

" خاران میں موجود غار جو قلعہ خاران کے قریب ایری کلگ کے دہانے پر ہے۔ بلوچستان کے تمام غاروں سے وسیع اور منفرد ہے۔ یہ پہاڑ کے ایک چٹان سے دوسری چٹان تک طویل ہے۔ ماضی میں یہ جنگلی درندوں کا مرکز رہا ہے لیکن عصر حاضر میں اس سے لوگوں نے دوسرے کام لئے۔ جن لوگوں کو سیاسی عقوبت یا جرائم کا خوف رہا ہے وہ غار میں نظروں سے اوجھل ہے۔ جب ضرورت ہوتی ہے اس میں

اونٹ، بیل اور دوسرے مویشی باندھے جاتے ہیں۔ خاران اور قلات کی خانہ جنگیوں میں خاران لشکر کا دفاعی مرکز رہ چکا ہے"۔(8)

کمبائی

ڈیرہ بگٹی ضلع میں موجود اس غار کے متعلق لکھا جاتا ہے کہ یہ ماقبل تاریخ دور سے تعلق رکھتا ہے۔ "اس غار میں داخل ہونے کے لئے ایک پہاڑی سرنگ سے گزرنا پڑتا ہے۔ غار کا فرش ریت سے ڈھکا ہوا ہے۔ یہاں پر چقمق اور مٹی کے برتن ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی تو ماہرین کو ناکامی ہوئی کیونکہ اکثر چرواہے یہاں اپنے مویشی رکھتے رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے اب قدیم آثار نہیں مل پائے۔ مقامی لوگوں کے مطابق یہاں سے مٹی کے برتن ملے ہیں جو کہ قابل استعمال حالت میں تھیں۔ اس غار کی چھت 25 فٹ اونچی ہے جس پر چونا کیا گیا ہے اس پر کچھ سرخ رنگ کے نقش و نگار ہیں۔ چھت میں نقش و نگار کے علاوہ چینی زبان جیسے الفاظ کنندہ ہیں۔ ایک دو جگھوں پر سواستیکا کے نشان بھی موجود ہیں"۔(9)

گدوگاہ

مری بگٹی علاقے میں جہاں پر راستہ گندائی قلعہ سے نکلتا ہے وہاں سے دس گھنٹے پہاڑی مسافت پر واقع ہے۔ پہاڑی جس میں یہ غار واقع ہے ان کے دونوں اطراف درخت ہیں یہیں سے غار کے اندر داخل ہونے کا راستہ ہے۔ غار کے دیواروں اور چھت پر تحاریر کنندہ ہیں اس کے علاوہ تصویر بھی بنی ہوئی ہیں جس میں ایک تصویر ہاتھی جیسے بڑے جانور کی ہے اس تصویر میں شکاری شکار کے اوپر نیزہ بلند کر کے کھڑا ہے۔

تورگھر

موسیٰ خیل ضلع میں موجود اس غار کے متعلق ماہرین کی رائے یہ ہے کہ 22000ق م سے تعلق رکھتی ہے۔ پہاڑی میں دو غار ہیں اور دو قدرتی ٹھکانے موجود ہیں جنہیں زمانہ قدیم میں انسانوں نے ٹھکانے کے طور پر استعمال کیا یہ غار اور ٹھکانے پہاڑی سلسلے کوہ سلیمان میں واقع ہیں۔ یہاں پر انسانوں اور جانوروں کی تصویریں نقش ہیں اس کے علاوہ کچھ تحاریر بھی ہیں۔ یہاں سے پتھر دور کے آثار بھی ملتے ہیں جس میں پتھر کی کلہاڑیاں و دیگر اوزار شامل ہیں۔

خزینہ بند

برشور کا زوئیلہ کے جنوب میں ایک میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی کی چوٹی پر موجود ہے جس کا راہ گزر بڑے پتھر کے باعث بند ہے۔ مقامی روایتوں کے مطابق یہاں کسی حاکم کا خزانہ مدفون ہے جو پتھر اس کے راستے پر موجود ہے۔ اس پر کچھ نقوش بنے ہوئے ہیں جو موسمی اثرات کے باعث پڑھنے کے قابل نہیں رہے۔ اس پر ایک ہاتھی کی تصویر نقش ہے، جس پر ایک شخص بیٹھا ہوا ہے۔

دھانہ عبداللہ زئی

"ژوب کے علاقے میں موجود اس غار کے متعلق ماہرین کی رائے یہ ہے کہ یہ 18000ق م سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں پر پتھر کے ابتدائی دور کے آثار ملے ہیں دیواروں پر جانوروں کی تصاویر کندہ ہیں"۔(10)

ریکو

سوراب سے نور گامہ سڑک پر مشرق میں 24 میل کے فاصلے پر ایک غار موجود ہے جو ماضی قریب تک زیر استعمال رہا ہے جس کی وجہ سے قدیم نشانات واضح نہیں ہے تاہم تھوڑی سی تنگ ودو سے لونڈو اور الخیرہ دور کے مٹی کے برتن کے نمونے وہاں سے ملے ہیں۔ اس کے باعث کہا جاتا ہے یہ غار زمانہ قدیم سے تعلق رکھتا ہے اور زیر استعمال چلا آرہا ہے۔

راکاہابند

راکاہابند ژوب میں واقع ہے۔ یہاں پر 18000 ق م سے تعلق رکھنے والی دس غاریں موجود ہیں۔ یہاں پر پتھر دور کے آثار ملتے ہیں دیواروں کو کھرچ نقوش بنائے گئے جس میں انسانوں کے علاوہ چیتے کی تصویر بھی ہے۔

زنکاری

" موسیٰ خیل ضلع کے زنکاری گاؤں میں 22000ق م سے تعلق رکھنے والی سات قدرتی غاریں ہیں جسے زمانہ قدیم میں انسانوں نے رہائش کی خاطر استعمال کیا۔ یہاں پہاڑوں پر نقش نگاری کے نشانات ملتے ہیں جن میں درختوں، جھاڑیوں اور انسانوں کے تصاویر موجود ہیں۔ یہاں سے گندھک اور میگنیز وغیرہ دھاتوں کے نشانات بھی ملے ہیں۔ جن کی مدد سے انسانوں نے وہاں نقش نگاری کی"۔(11)

غاریں انسانی تہذیب کو دریافت کرنے کی ابتدائی اوراہم ذریعہ ثابت ہوتی ہیں۔ بلوچستان ہر پہاڑی سلسلے میں درجنوں اور بلوچستان بھر میں سینکڑوں غاریں

موجود ہیں ان چند غاروں کا تذکرہ کتب میں آیا جن کو آپ کے سامنے لانے کا مطلب اربابِ اختیار کی توجہ مبذول کرانا مقصود ہے۔ فرانس، اٹلی، آسٹریلیا، برطانیہ، امریکہ، برازیل، چائنا، سمیت دنیا بھر کے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک نے اپنے اس تہذیبی ورثے کو محفوظ رکھنے کے لئے بھرپور اقدامات کرکے خطے کی تاریخ کو دنیا سے روشناس کیا ہے۔ بلوچستان میں بھی سینکڑوں غاریں موجود ہیں جن پر اگر سائنسی بنیادوں کو کام کرکے انہیں محفوظ کیا گیا تو اس خطے کو ایک نئی پہچان ملے گی اور دنیا کی تہذیبی ورثے کو نیا پہلو میسر ہو گا۔

حوالہ جات:

1۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر جھالاوان

2۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر لسبیلہ

3۔فاروق بلوچ۔ بلوچستان تہذیبی نقوش۔ فکشن ہاؤس لاہور

4۔غوث بخش صابر۔2008۔پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا بلوچستان۔لوک ورثہ۔اسلام آباد

5 ۔ محمود نظامانی۔2007۔تعارف و تذکرہ لاہوت

6۔میر علی شیر قانع ٹھٹھوی 2006 تحفتہ الکرام۔سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد

7۔بدر ابڑو۔1991۔ہنگلاج ایں لاہوت ڈند کتھائن جے پس منظر میں۔ سنگم پبلی کیشنز کراچی

8۔غوث بخش صابر۔2008۔ایضاً

9۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر ،ڈیرہ بگٹی

10۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر ،ژوب

1 1۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر۔لورالائی

لطیف کی شاعری میں سندھ و بلوچستان کے رشتے

ہوت جتّان، بلوچاں او بلوچستانء نام
کرتہ زندگ دا قیامتا گوں وتی پاکیں کلام
(پیرل زبیرانی)

یعنی ...

ہوت جتوں، بلوچوں اور بلوچستان کا نام
کیا زندہ تا قیامت ذریعے اپنے پاک کلام

سندھ جیسی حسین و زرخیر دھرتی اور بلوچستان جیسے انمول گلزمین اور ان کے باسی زمانہ قدیم سے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور ثقافتی طور پر ایسے اٹوٹ بندھن میں بندھے نظر آتے ہیں کہ انہیں الگ کر کے جانچنا، پرکھنا اور پھر انہیں تعلقات کے دھاگے میں باندھ کر دیکھنا انتہائی مشکل عمل ہے۔ بری اور بحری راستوں کے ذریعے دنیا سے رابطہ ہو یا قدیم تجارت کے ناطے۔ طالع آزماؤں کے حملے ہوں یا پھر بیرونی طاقتوں کے اس طرف یلغار۔ عالمی طاقتوں کی آپس کی رسہ کشی ہو یا بین الاقوامی سازشوں کے جال۔ سندھ و بلوچستان یکساں طور پر اکٹھے اور اثر انداز ہوتے دکھائی دیتے ہیں جس بھی شعبے، جس بھی میدان، جس وقعے اور جس بھی پہلو پر نظر ڈالیں گے تو یک جان دو قالب کے مصدر نظر آتے ہیں۔

جب کوئی موہن جودڑو کی تاریخ کو ٹٹولنے کی کوشش کرے گا۔ تومہر گڑھ کا تذکرہ خود بخود سامنے آجائے گا۔ کوئی کیچ کو پڑھے گا تو بھنبھور کی کہانی کھل جائے گی ۔ سیوہن لعل باغ میں فقیروں کی دھمال کے بارے میں قلم اٹھائے گا تو شاہ بلاول نورانی تک کٹھن سفر کرنے والے لاہوتیوں کو کیسے بھول پائے گا۔ عراقی تہذیب کے عروج کے زمانے میں مشرق سے میکن (بلوچوں) کے ساتھ تجارت کا حوالہ دے گا تو ملوہن (سندھی) کو کیسے نظر انداز کرے گا۔ سندھ کے جوگیوں کا ذکر کرے گا تو ہنگلاج کے سامیوں کو کیسے فراموش کرپائے گا۔ جھوک کے شاہ عنایت کا قصہ بیان کرے گا تو فتح پور کے صوفیوں کے کلام کی گونج بھی محسوس کرے گا۔پنّوں کے پیار کی مہک کا ذکر کرے گا تو سسّی کی محبت کو وسعت کی بلندیوں پر چھوتا ہوا دیکھے گا۔ فرہاد کی پیار میں جفاکشی کو دیکھے گا تو شیرین کا مہر میں جان کا نذرانہ دینے سے پردہ پوشی نہیں کرپائے گا۔ ہوشو شیدی کی وطن دوستی کا مثال دے گا تو نورا مینگل کو بھی فرنگیوں کے خلاف صف آرا دیکھے گا۔ شیخ ایاز کی فکری جدوجہد پر نظر ڈالے گا تو میر گل خان نصیر کی صعوبتوں کو بھی بھلا نہیں پائے گا۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ دونوں کسی ایک کی حیثیت، تاریخ اور اہمیت سے انکار کریں گے تو اس کی اپنی تاریخ بھی ادھوری رہ جائے گی۔

سب سے پہلے میں سندھ و بلوچستان کے قدیم دو لوک کہانیوں کا تذکرہ کروں گا۔ جن میں سے ایک سندھی لوک ادب کا حصہ میں تھا جس کا نام ہے سسّی پنّوں جس کو شاہ لطیف اٹھا کر دنیا بھر میں روشن کیا جبکہ دوسرا بلوچی میں ہے۔ شیرین فرہاد ہے جن کا

مقبرہ لسبیلہ سے تیس کلو میٹر کے فاصلے پر آواران ضلع میں جھاؤ کے مقام پر واقع ہے۔

سسّی سندھی تھی۔ پنوں بلوچ۔ تو شیریں بلوچ اور فرہاد سندھی! ان کہانیوں میں سسّی اور شیرین دونوں پیار میں جان کا نذرانہ دے کر لازوال کردار بن چکی ہیں۔ شیریں کی کنیز جب فرہاد کی قوم کا ذکر طنزیہ انداز میں کرتی ہے تو وہ اسے ڈانٹ دیتی ہے۔

گوشتہ کیغدیں دائی آ

فرات ماں بُنا درکھانڑے

سندھ ءِ نشتغیں جغدالے

گوشتہ بانکیں شیرین آ

دائی تھوَ مکن اے تات آ

عاشق نہ پھولنت ذات آ

(1)

یعنی...

معصوم کنیز نے کہا

فرہاد اصل میں ترکھان ہے

سندھ کا ایک جدگال ہے

مالکن شیریں گویا ہوئی

اے کنیز بے ہودہ باتیں نہ کر

عاشق ذات پات کو نہیں دیکھتے!

دوسری طرف سسّی اپنے پیار میں عاجزی وانکساری کی انتہا کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جیسا کہ

جیہی جے تیہی تہ بہ بانہی بارو چن جی
ججت ہوت پنّوں سیں موں کیمنٹری کیہی
اصل آری جام جے، پلے آں ۂ پیئ
ہوجا پائن پیر میں، تنہیں جتی نہ جیہی
وسارے وہی تن کیچین کھے کینئن رہاں

(2)

یعنی...

جیسے بھی ہوں تیری ہی میں باندی کو ہیار!
کیسے تجھے ناز دکھائے یہ برہن دلدار!
تیرا عاشق ہے روز اول سے تیری ہی ہے سہار!
کب ہے برابر خاکِ پا کے یہ دکھیارن نار
کیسے دوں بسار، اپنے کیچی جام کو سکھو! (3)

شاہ لطیف کون تھے؟ ان کی شاعری کیسی ہے؟ ان کا فکر و فلسفہ کیا ہے؟ یعنی لطیف شناسی کے موضوع پر درجنوں کتب شائع ہو چکی ہیں، سینکڑوں ہوں گی۔ شاہ جو رسالو کے ہزاروں پہلو ہیں پھر ہر پہلو میں کام کے لئے وسیع میدان کھلا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں پر ہم شاہ لطیف کی شاعری میں سندھ و بلوچستان کے تعلقات جیسے عنوان

کا مختصر جائزہ پیش کریں گے ۔ شاہ لطیف بلوچ اور بلوچستان کے ساتھ یوں پیوست دکھائی دیتے ہیں کہ انہیں وہ آفاقیت کے کردار میں ڈھال کر کہتے ہیں۔

واکا کر نڑ مون وس

بدھنڑ کم بروچ جو

شاہ لطیف کے اجداد کا تعلق ہرات سے تھا۔ بلوچ اُس خطے میں بھی زمانہ قدیم سے موجود ہیں۔ ان کا خاندان سندھ میں آکر آباد ہوا۔ یہاں پر بلوچ تاریخی طور پر اٹوٹ رشتے میں جڑے دکھائی دیتے ہیں۔ لطیف کی زندگی کے زیادہ تر سفر بلوچستان کی جانب رہے۔ تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ انہوں نے سیوہن سے لاہوت ، سسّی کی راہ کی جانب سفر اور ہنگلاج کی یاترائیں کیں۔ کیونکہ مورخ بتاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی 63 سالہ زندگی کے دوران 22 سال صحرانوردی میں گزاریں۔ بلوچستان میں ان راہوں پر آج بھی لطیف جی چج، لطیف جی مسیت (مسجد) لطیف جی کھوہی (کنواں) لطیف جی تیر تھ اور لطیف لک وغیرہ کے ناموں سے مقامات بلوچستان کی لطیف اور لطیف کی بلوچستان کے ساتھ قربت کی گواہی دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ "شاہ لطیف کے مویشیوں کے باڑ میں بھاگ ناڑی نسل کی لال گائیں بھی موجود ہوا کرتی تھیں"۔(4)

لطیف کے سفروں کے بارے میں بدر ابڑو یوں لکھتے ہیں۔

" ان کی زندگی کے اہم سفر پانچ یا چھ دیکھنے میں ملتے ہیں۔ کچھ ہنگلاج کی جانب، کچھ لاہوت کی جانب، ایک ملتان، کچھ تھر اور لاڑ اور اس طرف جو کہ آج کل ہندوستان

میں ہیں۔ پچھ کی جانب سفر کی روایتیں ملتی ہیں۔" (5)

شاہ لطیف نے سسّی کی زبانی پنوں کو پیار سے بہت سے ناموں سے پکارا ہے۔ جس طرح والدین اپنے بچوں سے لازوال پیار کے اظہار میں بے ساختہ طور پر ہر روز نت نیا نام دے کر اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح لطیف بھی پنّوں کو بلوچ، بلوچا، خان بلوچا، کیچی، ہوت، جت، آری، جام، آریانڑی، آریچہ، کوہیار کے نام سے پکارتے ہیں۔ جو ان کی بلوچ اور ان کے وطن سے لازوال پیار کے انمٹ نقوش واضع کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ محققین کے مطابق لطیف نے اپنی شاعری میں سندھ کے مختلف علاقوں اور ملکوں سے تجارتی تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بلوچستان کے علاقوں کیچ کا ذکر 174 بار، ہاڑہو کا 34، بپ کا 35، حب کا 8، وندر کا 25، ونکار کا 29، لس کا 2۔ مکران کا 2 اور سنگھر کا 8 بار ذکر کیا ہے۔

واضح رہے کہ 854 ق م سے قبل خضدار کا نام کوہیار رہا ہے۔ شاہ لطیف نے اپنے ایک سُر کا نام کوہیاری رکھا ہے۔ یہ ان کی بلوچستان کے قدیم تاریخ سے واقفیت کا منہ بولتا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ شاہ لطیف کے بلوچوں کی بہادری اور اولالعزمی کے ساتھ لگاؤ کے بارے میں سندھ کے نامور مورخ، دانشور، محقق اور سیاست دان جی ایم سید لکھتے ہیں۔

" بلوچ ہونا یعنی شاہ صاحب کی پسندیدہ خصوصیات کا حامل مرد ہونا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ کردار اپنانے کے لئے ذلت کی زندگی پر غیرت کی موت کو ترجیح دینے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوگا۔ ذاتی اور قومی خودداری کا جذبہ پیدا کرنا ہوگا۔ لالچ اور خوف کے مقابلے میں

ثابت قدمی پیدا کرنی ہو گی۔ اور حریت اور حق پرستی کی راہ اختیار کرنی ہو گی" ۔(6)

مذکورہ بالا الفاظ واضح کرتے ہیں کہ بلوچ، شاہ لطیف کا آئیڈیل انسان ہے وہ بلوچوں کی خوبیوں کو اجاگر کر کے ان کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جس کے بارے میں شاہ محمد مری لکھتے ہیں۔

" ہم دانشور لطیف کے بہت شکر گزار ہیں کہ اس نے ہماری توجہ ایک اور نعمت کی طرف مبذول کرائی۔ بلوچ بطور آئیڈیل انسان ! گو کہ بلوچوں کے بارے میں انگریز نے بھی کچھ کچھ تذکرہ کیا تھا۔ پرتگیزیوں نے بھی، اور فردوسی نے بھی۔ مگر بطور مہذب وشائستہ بلوچ کا نسبتاً جامع اور مربوط تذکرہ صرف شاہ لطیف کا حصہ تھا" (7)

بلوچستان اور بلوچ کے ساتھ ان کی انسیت کے دائرہ وسیع کرتے ہوئے اب شاہ لطیف کی بلوچی زبان کے ساتھ تعلق پر نظر ڈالتے ہیں۔ شاہ جو رسالوں میں " بھٹ کے دھنی " نے بہت سی زبانوں کے الفاظ اور محاورے استعمال کئے جن میں عربی، ہندی، فارسی، براہوئی، سرائیکی و دیگر زبانیں شامل ہیں۔ تو وہاں پر بلوچی زبان کو بھی اپنی شاعری میں یوں سمویا ہے جس سے دونوں زبانیں محبت کی پیکر بنی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ شاہ جو رسالو میں بلوچی زبان کے استعمال کے بارے میں ڈاکٹر رخمان گل پالاری لکھتے ہیں۔

" ان سب زبانوں میں سر فہرست عربی زبان ہے۔ جس کے محاورے مقولے، آیات اور کافی با معنی الفاظ بھی شاہ لطیف نے کثرت سے استعمال کئے ہیں۔ دوسرے نمبر جس زبان کے با معنی الفاظ استعمال کئے ہیں میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ بلوچی

ہے"۔(8)

شاہ لطیف کے رسالو بہت سے علما کرام، مفکرین اور محققین نے مرتب کئے ہیں ان میں سے اکثر نسخوں میں بلوچی الفاظ والے بیت موجود دکھائی دیتے ہیں۔ جن میں ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ، مرزا قلیچ بیگ، علامہ غلام مصطفی قاسمی، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ممتاز مرزا، سرائی امداد علی، محمد رمضان جت، بانہو خان شیخ، محمد قاسم راہموں، سگھڑ الہداد جنبھی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ لطیف بلوچی زبان کے ساتھ ساتھ بلوچوں دوسری اہم زبان براہوئی کو بھی اپنے اشعار میں پروتے نظر آتے ہیں۔ ان کے دو اشعار پیش خدمت ہیں۔

ٹِیّس جھنک جن جی، تنہی لوڑیہاس

مازآنہ گوار، ہیکلی ہیاس

وندر تھے ویاس، تڈہیں پنہوں گڈیم پب میں!(9)

یعنی...

جن کی بیٹی تھی انہوں نے بہادیا

اکیلی ہی تھی، نہ تھی ماں نہ بہن

وندر کی جانب جارہی تھی کہ پنّوں ملے پب میں!

براہوئی زبان میں یوں فرماتے ہیں۔

داسا، داکا داڑے ہنداڑے ہیئام

ہر داسا ہن حال جاہت ہوت ڈھام

پذیری ایندام پائے پیچ پریت جو ! (10)

یعنی ...

اب یہاں سے، یہیں، یہاں پر تھے

دیکھ میری کیفیت یہیں پر ہوت کو دیکھا

آخر آئیں گے پریت کا بندھن باندھ کر!

شاہ جو رسالو مرتب کرنے والوں کی بلوچی زبان سے نابلدی اور سندھ میں آباد بلوچوں کی بلوچی ادب سے دوری کے باعث اکثر نسخوں میں بلوچی الفاظ، محاوروں کے معنی غلط لکھے گئے بلکہ ان کی تلفظ بھی صحیح نہیں لکھی گئی ہیں۔ جس سے ان الفاظ اور محاوروں کی شاعری کی تشریح میں غلط معنی نکالے گئے۔ لیکن اس کے باوجود شاہ لطیف کے شاعری میں عمومی اور سر دیسی میں خصوصی طور پر بلوچی زبان کا ذخیرہ ملتا ہے۔

شاہ لطیف کی شاعری میں بلوچ اور بلوچستان کا تذکرہ سسّی پنوں کے داستان کے پس منظر دیکھا گیا ہے جب کہ رسالو کو غور سے پڑھیں گے تو اس میں سر کھاہوڑی، رام کلی اور سر گھاتو میں بھی بلوچستان کا تذکرہ واضح طور پر موجود دکھائی دیتا ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتاہوں بلوچ اور بلوچستان کے تذکرہ پانچ نہیں آٹھ سروں میں موجود دکھائی دیتا ہے۔ تاہم سسّی پنوں کے قصے کے پس منظر میں شاہ جو رسالوں کا تجزیہ کرتے ہوئے گل حسن کلمتی لکھتے ہیں۔

" شاہ جو رسالو میں ٹوٹل 44 سو اشعار ہیں جس میں سسّی پنوں کے داستان کے 11 سو اشعار ہیں۔ اس طرح رسالے کا تین چوتھائی حصہ اس قصے پر مختص ہے۔ شاہ لطیف

نے اپنے رسالے میں سر دیسی، کوہیاری، آبری، معذوری اور حسینی میں اس قصے کا تذکرہ کیاہے۔" (11)

شاہ لطیف کی شاعری اپنے دور کا آئینہ ہے۔ اس دور میں خطے میں موجود سیاسی اتار چڑھاؤ، سیاسی، معاشرتی اور معاشی خوبصورتیاں اور بداعمالیوں کا چشم دیدہ گواہ ہیں آغا سلیم لکھتے ہیں۔

" دنیا کا ہر بڑا شاعر اپنے دور کا شعور اور زمانے کا ضمیر ہوتا ہے اس کی شاعری اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور معاشی عوامل کا احساتی رد عمل تو ہوتی ہے لیکن آنے والے، زمانوں کی ضمیر کی آواز بھی ہوتی ہے۔ شاہ لطیف ایسے ہی عظیم شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں نہ صرف اپنے دور کو سمویا ہے بلکہ ہمیں ہمارے دور کا شعور بھی دیاہے(12)

شاہ جو رسالو کا مطالعہ کرنے کے بعد بہت سے لوگوں کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے ۔ شاہ لطیف کو بلوچستان میں موجود قبائلی نظام کی بد صورتیاں کیوں نظر نہیں آئیں ۔ کہیں اس نے تصویر کا ایک رخ تو پیش نہیں کیا۔ بلوچ و بلوچستان کے حوالے سے ، سب اچھا... سب بہتر اور آئیڈیل انسان کا تصور سامنے رکھا۔ توان کے لئے گوش گزار کروں کہ شاہ لطیف جیسے زیرک، انسان سے یہ غلطی کیسے ہوسکتی ہے۔ کیونکہ شاہ لطیف کے دور میں بلوچستان کے بلوچ جمہوری قبائلی نظام کے ضوابط کے مطابق زندگی گزار رہے تھے جہاں پر موقع پرستی، مفادپرستی، خود غرضی ، ابن الوقتی، وطن دشمنی اور غداری کی بیج بوئی نہیں گئی تھی۔ جہاں پر بلوچی زبان بھی تھی، رسم بھی تھی، ضابطہ اخلاق بھی تھی اور دستور العمل بھی۔

فرنگیوں کی آمد شاہ لطیف کے بعد کا دور ہے۔ فرنگیوں کے آمد کے بعد ہمارے معاشرے میں ان کی خدمت گاروں، کاسہ لیسوں اور تمغہ داروں کی فوج تیار ہونے لگی۔ جمہوری قبائلی نظام کی جگہ موروثی سرداری نظام جیسی جاگیر دارانہ سماج نے لے لیا۔ پھر یہاں ایسے پُرخار بیج بوئے گئے کہ ان سے خرابیوں اور بدصورتیوں کی ایک ایسی فصل تیار ہوئی کہ اب تک ہم اس کو بھگت رہے ہیں۔

شاہ لطیف کی شاعری میں سندھ و بلوچستان کے لازوال محبت کے بندھن اور قدیم سیاسی، سماجی، ثقافتی اور تجارتی ناطوں کی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ جیسے "تن تسبیح من منڑیو جن"۔

آج کا دور تقاضا کرتا ہے ہم کھاہوڑی بن کر عہد کریں کہ ہم لطیف کے فلسفے پر عمل پیرا ہوئے ہوئے "سندھ و بلوچستان میں مفاد پرستی، خود غرضی، ابن الوقتی، وطن دشمنی اور غداری، بھوک، افلاس، تنگ دستی، تنگ نظری، فرقہ پرستی جیسی غلاظتوں سے کو پاک کرنے کا بیڑہ اپنے کاندھوں پر اٹھائیں اور لطیف کی ان دعاؤں کو اپنی عملی زندگی کا حصہ بنالیں۔

سائینم سدائیں کریں متھے سندھ سکار

یعنی　　اے خداوند سندھ آباد رکھ

اللہ آرتیچن کھے کو سونہ لگے واؤ

یعنی　　اے خداوند! بلوچوں کو آلام وابتلا کی گرم ہواؤں سے محفوظ رکھ

حوالہ جات:

1۔ ایم لانگ ورتھ ڈیمز۔1988،پاپولر پوئیٹری آف بلوچیز،بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ص،119

2۔ علامہ غلام مصطفی قاسمی۔2009ءشاہ جورسالو۔مہران اکیڈمی شکارپور۔ص،323

3۔ آغا سلیم۔1992۔شاہ جورسالو(اردو) لوک ورثہ اسلام آباد۔ص،469

4۔ منظور احمد قاسرو۔2009ء شاہ عبداسلطیف بھٹائی حیات وافکار،سندھیکا اکیڈمی کراچی۔

5۔ بدر ابڑو۔2014ء۔سندھ جو شاہ۔روشنی پبلیکیشنز کنڈیارو۔ص،206

6۔جی ایم سید۔2013ء۔پیغام لطیف فکشن ہاؤس لاہور۔ص،105

7۔شاہ محمد مری۔2017ء شاہ لطیف بھٹائی۔سنگت اکیڈمی کوئٹہ۔ص،106

8۔ ڈاکٹر رحمان گل پالاری۔2017ء سر دیسی میں بلوچی زبان(کیچ،ماضی حال اور مستقبل)
نظامت ثقافت بلوچستان کوئٹہ(مرتب پناہ بلوچ)ص،340

9۔ محمد قاسم راہموں۔2013ءشاہ جو گنج۔روشنی پبلیکیشنز کنڈیارو۔ص،255

10۔ مرزا قلیچ بیگ۔2007ء۔شاہ جورسالو۔سندھی لینگویج اتھارٹی حیدر آباد۔ص،261

11۔ گل حسن کلمتی۔2017ء کیچ اور بھمبھور کے تعلقات(کیچ ،ماضی،حال اور مستقبل مرتب
پناہ بلوچ)نظامت ثقافت بلوچستان کوئٹہ۔ص،19

12۔ منظور قناسرو۔2009ءشاہ عبدالطیف بھٹائی حیات وافکار۔سندھیکا اکیڈمی کراچی۔ص،9

ہر بوئی... خوشبوؤں سے مہکتی تاریخی وادی

بلوچستان بلند وبالا پہاڑوں، نشیبی کوہستانی سلسلوں، وسیع و عریض میدانوں، طویل ساحل اور لق ودق صحراؤں پر مشتمل ایک ایسا خطہ ہے، جو عرضی اور موسمی لحاظ سے مختلف النوع ہے۔ اگر وسطی علاقہ بلند و بالا پہاڑوں پر مشتمل ہے تو انتہائی مشرق، انتہائی مغرب اور جنوب میں نشیبی پہاڑی سلسلے پائے جاتے ہیں۔ شمال مغرب اور قدرے مغرب کا علاقہ ریتیلے صحراؤں پر مشتمل ہے، انتہائی جنوب میں سمندری علاقہ ہے، جبکہ کچھی، سبی، بیلہ اور دشت مکران کا علاقہ میدانی ہیں۔ ملک سعید احمد دہوار بلوچستان کا جغرافیائی نقشہ اس خوبصورتی کیساتھ بیان کرتے ہیں۔ "بلوچستان کی سرزمین اپنی آب وہوا کی شدت، رقبہ کی وسعت، مسافتوں کی طوالت، آبادی کی قلت 'محدودوسائل آب پاشی، قابل کاشت اراضیات کی کمی، معدنیات کی فراوانی سرسبز وشاداب وادیوں، بے آب وگیاہ لق ودق میدانوں، جنگلات وسبزہ سے عاری گھٹے ہوئے پہاڑی سلسلوں، دشوار گزار درّوں کی وجہ سے اس کُرّہ ارض پر ایک عجوبہ کی حیثیت رکھتی ہے"۔(1)

بلوچستان کی سرزمین وسیع و عریض دامن، لاتعداد قدرتی مناظر، دلکش وادیوں، حسین گھاٹیوں، دلفریب ساحلی مقامات اور سرور انگیز تفریحی ٹھکانوں کے ساتھ پُرکشش خطہ ہے۔ جہاں پر ہزارہا سال کی انسانی فطرت کی کرشمہ سامانیاں نظر آتی ہیں، تو تلواروں کی جھنکار اور بندوقوں کی گھن گھرج کے پس منظر میں صلح وآشتی، مہر ومحبت، اخلاص ووفا اور ایثار وقربانی کے شیریں نغمات بھی گونجتے دکھائی دیتے

ہیں۔ تاہم ہمارا موضوع قلم بلوچستان کی تاریخی، حسین ودلکش اور خوشبو بھری وادی ہربوئی ہے۔

ہربوئی جس کے بارے میں جھالاوان ڈسٹرکٹ گزیٹیئر میں لکھا گیا ہے کہ یہ دو لفظوں یعنی "ہر" معنیٰ (تمام۔ بہت سے) اور "بوئی" معنیٰ (خوشبو) کا مجموعہ یعنی (ہربوئی، بہت سی خوشبوئیں) ہے"۔(2) اس میں کوئی شک نہیں کہ ہربوئی لاتعداد قدرتی جڑی بوٹیوں کے خوشبو سے مہکتی اور طویل رقبے پر پھیلی ہوئی صنوبر کے درختوں سے بھری وادی ہے۔ راقم الحروف نے ایام طالب علمی میں 1995ء میں ہربوئی کے اسٹڈی ٹور کے بعد (Harboi-a facinating tourist spot) کے عنوان سے مضمون لکھا تھا جو کہ روزنامہ ڈان کراچی کے 21 دسمبر 1995ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ وادی میں بہت سی جڑی بوٹیوں کے خوشبوؤں کی مہک سے محظوظ ہونے کے بعد ڈسٹرکٹ گزیٹیئر کے مصنف سے بے ساختہ طور پر ہم خیال رہا۔ تاہم بعد میں مزید تحقیق سے اس نام کے کئی پوشیدہ راز کھلتے گئے اور میرا نظریہ بھی تبدیل ہوا، جب ڈسٹرکٹ گزیٹیئر کو پڑھا تو اس میں اس پہاڑی سلسلے کے حدود اربع کے متعلق لکھے گئے حقائق نے بھی کئی دیگر راز عیاں کر دیئے۔

محمد حسن بلوچ اپنی کتاب "بلوچستان ءِ جغرافیہ" میں لکھتے ہیں کہ: "کوہ وسطی براہوئی سلسلہ ساراوان سے جھالاوان تک پھیلا ہوا ہے، اس پہاڑی سلسلے کا نام "ہربوئی" ہے۔(3) جس کو برطانوی افسروں نے وسطی براہوئی کا نام دیا۔ جبکہ ڈسٹرکٹ گزیٹیئر کے مصنف نے بھی ہربوئی کا حدود اربع یوں بیان کیا ہے، "اس

کے مغرب میں سوراب وادی، مشرق میں سونڈان ندی ہے، جنوب میں انجیرہ وزہری ہیں جبکہ شمال میں قلات سے کابل تک پھیلا ہوا ہے"۔ جبکہ ونسنٹ اے سمتھ" کے لکھے گئے کتاب "تاریخ ہند" کا حوالہ دیتے ہوئے فاروق بلوچ رقمطراز ہیں کہ "سکندر اعظم واپسی کے دوران جب سندھ سے بلوچستان کے حدود میں داخل ہوا اور دریائے پورالی کے قریب پہنچا تو دریائے پورالی کے قریب اس کا سامنا اربوئی قبائل سے ہوا جو بلامزاحمت اپنے پہاڑی مساکن کی جانب فرار ہوئے، ان کا دریا (پورالی) اربیئس کہلاتا تھا، جبکہ ان کے پہاڑ اور قبائل اربوئی کہلاتے تھے"۔(4) اسی طرح ہم بلوچ قوم کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو بہت سے قبائل کا نام اور پہچان اسی طرح نظر آتے ہیں جیسا کہ دشت کے رہنے والے دشتی، بلیدہ کے رہنے والے بلیدی، مگسی کے رہنے والے مگسی، گش کور کے رہنے والے گشکوری، وغیرہ شامل ہیں۔ مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں ہربوئی پہاڑی سلسلہ پورالی سے لیکر کابل تک پھیلا ہوا تھا، جو اربوئی قبائل کا مسکن تھا، بلوچ قوم کی تاریخ بھی ابتدائی طور پر جس طرح سے مسخ کر کے پیش کی گئی اور مہر گڑھ کے قدیم وارثوں جس طرح نووارد قرار دیا گیا اسی طرح ہربوئی کی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش بھی بڑے زور وشور سے کی گئی لیکن حقائق کو چھپایا نہیں جاسکتا۔ تاریخ کے اوراق ہر چیز کو عیاں کر دیتے ہیں۔

اس وادی میں موسم سرما میں اکثر اوقات درجہ حرارت نقطہ انجماد سے گرا رہتا ہے گزشتہ سال بھی درجہ حرارت منفی 21 ریکارڈ کیا گیا۔ تاہم موسم گرما بھی

موسم زیارت سے زیادہ ٹھنڈا اور خوشگوار رہتا ہے۔ صنوبر کے درخت پورے وادی میں پھیلے ہوئے ہیں تاہم وہاں پر زیتون، بادام، انجیر، درخت مسواک کے علاوہ گل لالہ، زیرہ، جھنڈ بیری، ازشک بوٹی، نئے قلم، دھتورہ، بھنگرہ، عناب، اومان، ہنیگ، اجوائن خراسانی، جنگلی پودینہ، سیاہ چوب، گڈیلی، رتن جوت، ہرمل، اسپغول، خفص ہندی، عنب الثعالب، زم ہراب، کالی تلی، صفر، گاؤزبان، دارہلد، پنیرباد، کریات، دھماسہ، مارموت، جل جمنی بوٹی، چنچین بوٹی، زاول، ملٹھی، جنگلی پوست، ڈھائی پتہ، مزری کے ساتھ ساتھ سینکڑوں اقسام کی جڑی بوٹیاں، جھاڑیاں اور درجنوں اقسام کے درخت پائے جاتے ہیں۔ تاہم یہ دعویٰ کے ساتھ کہاجاسکتا ہے کہ جتنی قدرتی جڑی بوٹیاں اس وادی میں یکجا مل سکتی ہیں کسی اور جگہ پر ممکن ہی نہیں۔ اس کے علاوہ یہاں پر جنگلی حیات بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں، جن میں پہاڑی بکرے، دمبے، چیتے، عقاب، چکور، تیتر، بٹیر، بلبل، سیسو، ودیگر قابل ذکر ہیں۔ جنگلات و جنگلی حیات کے تحفظ اور فروغ کے لئے کسی قسم کے اقدامات نہ اٹھائے جانے کی وجہ سے ان کی بقاء کو خطرہ موجود ہے۔

اس وادی میں ہمندوکشتہ نامی پہاڑی چوٹی کی سطح سمندر سے بلندی 9,040 فٹ، لوکرا 9,622 فٹ، زیندانی 9,424 فٹ، گولک 9,278 فٹ، ککو 9,830 فٹ، سرکہ کوہی 9,530 فٹ، ہنیار 8,095 فٹ، دیہزا 8,680 فٹ، چھپ 8,150 فٹ، دیموئی 9,075 فٹ، گیشکو 9000 فٹ، بلند ہیں۔ ان پہاڑی سلسلوں میں متعدد چھوٹے نشیبی علاقے ہیں جن میں دشتک، پیازی، گولگ چھپ، الینٹ ممی،

اور کھتونکی وغیرہ واقع ہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹی وادیاں بھی ہیں جن کے نام اسکلکو، سیخڑی، سرکین، ممتاوا، لانگاری، کرودی، پندران، نیچارہ اور ہمیری ہیں۔ یہاں پر تنگ گھاٹیاں بھی ہیں، سب سے خوبصورت تنگ گھاٹی چرکمب ہے، جو کہ کپوتو اور پندران کے جنوب مشرق میں چھوٹی وادی خُدی میں واقع ہے۔ یہ گھاٹی بہت سی جگھوں پر 5 فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں ہے تاہم پہلو تین سو فٹ سے زیادہ طویل ہیں۔ یہاں پر ڈولی، گردو، لونڈو اور گداتا کمب ایسی جگھیں جہاں کی تہہ تک سورج کی روشنی نہیں پہنچ سکتی جس کی وجہ سے گرمیوں میں بھی یہاں پر پانی برفیلی ٹھنڈی ہوتی ہے۔ نیچارہ اور کپوتو کے راستے ایک اور گھاٹی ہے جس کا نام جرگی ہے، یہاں پر ایک اور دلکش گھاٹی ہے جس کا نام چشمئی ہے جو کہ نیچارہ شروع ہوتی ہے دیمونی اور پوٹائی پہاڑی سے ساری، شیر اور سُر خین تک ہے، اسکے علاوہ پنج لکی، شہہ جامی، ملی نام، سنجر کشتہ اور سری شہر گھاٹیاں بھی ہیں۔ ریشک پہاڑی علاقے میں پیر علی بے زات اور پیر گدّو کی زیارتیں ہیں۔ یہاں کے آبادیاں یوں ہیں روبدار، تخت، گزگ، جوہان، کاریز ایسفی، سور، ککو، خیسار، چکل، گل دونی، عالی دشت، سری شہر، سُر خین، لہڑ، ہادر کش، بغڑکش، دونی، گلک، وغیرہ ہیں۔ صوبے کے اہم موسمی نہر دریا مولہ اس وادی کے گزگ سے جبکہ سیخڑی سے سکلیجی، اور انجیرہ سے، دشتک سے نکلتی ہیں۔

ہربوئی کی تاریخی اہمیت صدیوں سے قائم ودائم ہے، نامور گلوکار اختر چنال ایک مشہور لوک گیت ''دانہ پہ دانہ'' میں جب بلوچستان کے تمام علاقوں کی تعریف کرتے ہیں تو وہاں پر ہربوئی کو بھی نہیں بھولتے اور کہتے ہیں کہ ''واہ واہ ہربوئی و مرجان''۔

یہاں گشک پر پہاڑی کے اوپر پولیٹکل ایجنٹ قلات کیلئے گرمیوں کے رہائش کیلئے 1904ء میں ایک بنگلہ بھی تعمیر کیا گیا، وہیں پر خان قلات کی رہائش گاہ، مسجد اور خدمت گاروں کے کوارٹر بھی بنے ہوئے ہیں، کیونکہ یہاں پر خان قلات نہ صرف تفریح کیلئے تشریف لاتے تھے بلکہ گرمیوں میں یہاں دربار بھی لگاتے تھے۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیئر کے مطابق یہاں پر گرمیوں میں گھاس کی بہتات کی وجہ سے شاہوانی، پندرانی، لہڑی، جتک اور بارانزئی مینگل اپنے مویشیوں کو یہاں لاتے تھے اس کے علاوہ یہی لوگ وہاں پر خان قلات کے محافظ اور نگران کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔

ہربوئی جیسا خوبصورت، حسین اور دلکش تفریحی مقام قلات کے مشرق اور بلوچستان کے مرکز میں واقع ہے، جبکہ لاڑکانہ، سکھر، سبی سے 5 گھنٹے کی مسافت، کراچی، تربت، مکران، نوشکی اور خاران کے علاقے سے 6 گھنٹہ، اور صوبائی دارالحکومت سے 4 گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ لیکن بنیادی سہولیات کے فقدان کی وجہ سے انتہائی اہمیت کے حامل صنوبر کے جنگلات سے بھرا اور خوشبوؤں سے مہکتا ہوا تفریحی مقام ملکی اور بین الاقوامی سیاحوں کے نظر سے اوجھل ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہاں پر سیاحوں کی ضروریات کے مطابق بنیادی سہولیات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ جنگلات اور جنگلی حیات کے تحفظ کے لئے اقدامات کرنے کے علاوہ جڑی بوٹیوں کیلئے تحقیقی ادارہ بنایا جائے۔

حوالہ جات:

1۔ملک سعید احمد دہوار۔1968۔بلوچستان تاریخ کی روشنی میں۔نساٹریڈرز۔کوئٹہ

2۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر سیریز۔جھالاوان

3 ۔ محمد حسن بلوچ۔۔۔ بلوچستان ءِ جغرافیہ۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

4۔فاروق بلوچ۔2012۔بلوچ اوران کا وطن۔ فکشن ہاؤس۔لاہور

فتح پور کے صوفیا

دان بنے ہے دکھ کا کارن، بن بھکشا مسکائیں

صوفی وہ کہلائیں، جن کی جھولی خالی (1)

(شاہ لطیف۔ آغا سلیم)

فتح پور نام کے ساتھ راقم الحروف کا تاریخی اور روحانی عقیدت کا رشتہ ہے۔ تفصیلی ذکر سے قبل تاریخی رشتے کے بارے میں سرسری اظہار کرتا چلوں۔ قدیم کچھی کے تحصیل بھاگ سے جنوب مغرب کی جانب چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع موضع گدّڑ کے مقام پر ایک قدیم ٹیلہ ہے۔ جس کا تذکرہ قدیم نسخہ جات، بلوچی کلاسیکل شاعری اور تاریخی دستاویزات میں موجود ہے اس کے علاوہ کم سنی میں میں نے بزرگوں کی محافل میں تاریخی واقعات کے قصے کہانیاں سنتے ہوئے یہ تذکرہ سنتا رہا کہ اس جگہ پر بلوچ تاریخ کے نامور شخصیت میر چاکر رند کا قلعہ ہوا کرتا تھا۔ رند کیمیا گر ہوا کرتے تھے اور غروب آفتاب کے وقت اس قلعے کا سایہ جہاں پڑتا تھا۔ وہیں پر خزانہ مدفون ہے۔ تاریخ سے آشنائی کے بعد حقیقت آشکار ہوئی کہ واقعی اس جگہ کا بلوچی ادب بہت سے قصے اور کہانیوں میں تذکرہ ملتا ہے۔ انمول مہر و محبت کی داستانوں میں ذکر موجود ہے۔ یہیں پر بھی بلوچی محافل سجتی رہی ہیں۔ رزم و بزم کی داستانیں جنم لیتی رہی ہیں۔ سوران، فتح پور اور سبی میں موجود میر چاکر رند کے قلعے اور بلوچوں کے دستیاب ادبی خزینے بلوچ تاریخ کے روشن پہلو کی نشاندہی کرتے نظر

آتے ہیں۔

قدیم فتح پور کے شمال کی جانب چند کلومیٹر کے فاصلے پر بڈّا کے مقام 1833ء میں ایک چمکتے ستارے کا جنم "تاج محمد تاجلؔ" کے نام سے ہوتا ہے۔ڈاکٹر عبدالرزاق صابرؔ اپنے ایک تحقیقی مقالے میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔(2)

"وہ بچپن سے براہوئی زبان میں شاعری کیا کرتے تھے۔ لیکن شاعری میں بلوغت چالیس سال کے عمر کے بعد نظر آتی ہے۔ جب وہ سندھ و ہند کے مختلف علاقوں میں صوفی ہستیوں کے مزارات اور درگاہوں کے زیارت کرکے واپس آئے۔ کچھی کا میدانی علاقہ جہاں پر تاجل کی زیادہ تر زندگی گزری ایک کثیر الزبانی علاقہ ہے۔ جہاں پر بلوچی، براہوئی، سندھی اور سرائیکی زبانیں بولی جاتی ہیں۔اس لئے تاجلؔ بلوچستان کے کثیر الزبانی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں"۔

تاج محمد تاجلؔ نے بھی مذہبی، مزاحیہ ، اصلاحی شاعری کی ۔ بلوچی اور براہوئی کلام کے ساتھ سندھی کی کافیاں بھی کچھی کے لوگوں میں مشہور ہیں۔ڈاکٹر عبدالرزاق صابرؔ مزید لکھتے ہیں۔

" تاجل کے کافیاں، سہ حرفی اور دوہے صوفی فکر وخیال سے بھرپور ہیں۔براہوئی زبان میں کلاسیکی انداز میں شاعری کی ۔ انہوں نے شاعری میں بلوچستان کے حقیقی ثقافت اور خانہ

بدوشانہ زندگی کے پہلوؤں کو خوبصورت انداز میں پیش کیا۔"

کچھی کے علاقے میں مزارعین کے ساتھ جاگیرداروں کے ظلم و ستم اور غیر انسانی سلوک کو دیکھ کر تاجلؔ یوں کہتے ہیں۔

؎ تم اگر انسان ہوتے
صاحب ایمان ہوتے
پاک پرور کی قسم
ہرگز نہ کرتے یہ ستم
وہ بھی انسان ہیں
صاحب ایمان ہیں
تو یہ حیوانی سلوک
اس پر ستم فاقہ و بھوک
حیران ہوں کہ روز جزا
تم کو ملے گی کیا سزا
(ترجمہ: عبدالرحمن غورؔ)

عبدالرحمن غورؔ لکھتے ہیں:

" تاجلؔ نے اپنی شاعری میں جہاں اپنے ملک کے غریب لوگوں کی ترجمانی کی ہے۔ وہاں معرفت کی کچھ باتیں بھی کہی ہیں۔ چونکہ اس دور میں تصوف و معرفت کا چرچا تھا۔ اس لئے تاجل نے بھی اکثر اشعار اس رنگ میں لکھے ہیں"۔(3)

قدیم فتح پور سے جنوب کے جانب قندابیل، گنجابہ اور موجود گنداواہ نامی شہر کے نزدیک فتح پور کے نام سے آباد قصبہ ہے جس میں ایک روحانی چشمہ پھوٹا جس کے فیض کے کرنیں دور دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جس کے متعلق اسی فتح پور کے روحانی رہبر صوفی سید رکھیل شاہ خود کہتے ہیں۔

وہوا فتح پور جی پچر		آ ہے عشق جی جاتھے خبر
''رکھیل ''رمز جی لکھی تبر		وڈھیوں وجے اسرار ڈے
یعنی وہوا فتح پور کی کہانی،		جہاں ہے عشق کی خبر (4)

صوفی ''رکھیل ''عشق کا ہے تیز تفر کاٹ دیتا ہے اسرار کی طرف

اسی طرح صوفی چیزل شاہ فتح پور کے بارے میں فرماتے ہیں۔

ے فیض فتح پور عشق الٰہی
گھوٹ رکھیل داثانی
شعاع شمع تے عاشق آون
پتنگ سویں پروانے
جھوک میراں پور عبدالستار
''چیزل'' قدم قربانی(5)

صوفی فیضل فقیر لاشاری فتح پور کے ساتھ یوں عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

ے فتح پور وچ محب ملیوسے
رایا روز ازل دا

کن فیکوناں اگّ ہویوسے

گانڈھا بے وس دل دا

بات برہ دی سمجھنڑ مشکل

چارا نفس دا نہ چل دا

فیضلؔ عشق اویڑ نہیں

کم ہر کنہں ناقابل دا (6)

صوفی پہلوانؔ فقیر ڈومکی فتح پور پر اپنے گلہائے عقیدت یوں نچھاور کرتے ہیں۔

؎ فتح پور میں میرا ہے مرشد بحال

پیرے مغاں دست دیا دلال

نظر سے کیا پہلوانؔ کو نہال

دکھایا سکھایا ہے قلبی ذکر (7)

صوفی محرمؔ فقیر لاشاری اپنے شعر میں فتح پور کی شان یوں بیان کرتے ہیں۔

؎ سگھو موٹ سید فتح پور جاوالی

آ ہیاں در تہنجے تے مٹھّا ماں سوالی (8)

ڈاکٹر غلام نبی سدھایو صوفی رکھیلؔ شاہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"شاہ لطیف سے لے کر اب تک تمام کلاسیکی شاعری کا انداز بیاں کی یکسانیت کی مثالیں موجود ہیں لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس دور کی انفرادیت کو پہنچانا نہ جا سکے۔ بات یہ ہے کہ اسی

دور کے شاعر بہت سی صوفیانہ رمز، فن اور ادائیگی کی یکسانیت
کے باوجود زبان و مکاں کے مسائل کے سرحدات پر ایک
دوسرے سے واضح طور پر الگ تھلگ اور منفرد نظر آتے ہیں۔
سید رکھیل شاہ بھی ایسے ہی صوفی شعراء کی لڑی کا حصہ ہے۔
جس نے اپنے عشق کے علم سے وادی گنداواہ بلوچستان میں ایسی
نور کی بارش کردی کہ یہ خشک اور بیاباں زمین کستوریوں اور
خوبصورتیوں کی آماجگاہ بن گئی۔

سید رکھیل شاہ(15-03-1846-22-04-1931)

سید رکھیل شاہ کو تصوف کے میدان میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ان کا شعری مجموعہ "بحر العشق" کا پہلا حصہ 1923ء میں محمد علی آفندی مجسٹریٹ نے جبکہ دوسرا حصہ فقیر پیر بخش نے 1952ء میں شائع کیا۔اس کے بعد دونوں حصوں کو یکجا کر کے 1968ء میں سیٹھ ہرگن داس ولد کندومل پارواڑی نے شائع کرائی۔رسالے کی چوتھی اشاعت 1995ء میں فتح چند کنیا لعل کارڑا نے شائع کی۔اس کے بعد پانچویں، چھٹی اور ساتویں اشاعت بالترتیب 2005,2001 اور 2008ء میں انہوں نے کرائی۔ ان کے رسالے میں سندھی، سرائیکی، بلوچی، اردو، فارسی، براہوئی زبان کے کلام شامل ہیں۔ جبکہ ان کے ایک کافی میں بلوچی اور سندھی زبان استعمال ہوا ہے۔

بروچیو بلوچن، نال نہ نیّن، سدا منہنجو ساہ جو سمر آنندان من پاذبی آں، چھپاگشاں تھا
نگو رواں مبن ماں وجھاں سیج سکھن ڈساں ڈکھن، ایھوماں تے ازلی امر آدو شی دیشاں

مر و شی گنداں، حال تھئی اے واقف بیاں قول کیوماں ساں کیچن، سچو سچن، نہ تہ ماں تے ڈیہہ جوڈمر آوثی جندء جاناں گنداں، تھوکے مئی اے دلبند گچ تھااندر میں گرن، مچ تھامچین، نشوماں کھے نیہن جو خمر آگُشی "رکھیل" دے حالا ،وثی صدقہ کھئے خیالا عشق آنبھ اچن ،روحی رچن، منھنجو منیر بدر آ

صوفی رکھیل شاہ کے بارے میں امیر بخاری لکھتے ہیں۔

" بلوچستان کے صوفی بزرگ سید رکھیل شاہ کافی کے بلند پایہ شاعر گزرے ہیں ان کا کلام بلوچستان کے علاقے کے سندھی کا عمدہ نمونہ ہے۔ان کے کلام میں سندھی الفاظ کے ساتھ بلوچی کے الفاظ کا امتزاج بھی ہے"

وہ ان کے سندھی کافی کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

ے دل میں مرے دلبر ملا
جب موج مستی دیکھ لی
دنیا سے دوری ہوگئی
ہستی عقل چلتی بنی
صورت اندر سرور ملا
ہر کام اور ہر حال میں
ہر اک جگہ، ہر اک خیال میں
جب آنکھ باطن کی کھلی
اعلیٰ وہاں انور ملا

ہے رمز رندی حال سے
پھر بھی قلندر نا ہوئے
جب عشق رکھیلؔ کو ملا
اسی وقت ہی پرور ملا

☆☆☆

(سید چیزلؔ شاہ 26-04-1914,16-05-1984)

سید رکھیلؔ شاہ کے فرزند ارجمند ہیں۔ان کا شعری مجموعہ ‘‘بحرالعمیق‘‘ کے نام سے پہلی مرتبہ فروری 1987ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد مارچ 2001ء اور جنوری 2004ء میں دوسری اور تیسری مرتبہ چھپاہے۔ان کے متعلق ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو لکھتے ہیں:۔

اردو کا مصرعہ ہے ۔ ہے آدمی بجا خود اک محشر خیال‘‘ میں انسان کے خیالات کی دنیا کا اشارہ ہے۔اس کے مطابق اس کے دل کے خیالات کا آباد دنیا ہے۔جس میں مجازی اور روحانی زندگی کے تتلیوں کے رنگ سمائے ہوئے ہیں۔دنیاوی زندگی اعلیٰ انسانوں کے لئے ایک قید خانے کی مترادف ہے۔وہ ان کے مالک کے دسترس میں ہے وہ خود بے بس ہے۔جیسے سید رکھیلؔ شاہ فرماتے ہیں۔

وس نہیں چلدا
حجت نہیں ہلدی
رت رووال ہتھ دھوواں
جند پئی جلدی

سندھی اور سرائیکی شاعری کے روایتوں نے گذرے ہوئے تین سو سالوں میں واضح رنگ حاصل کئے۔ شاہ کریم، شاہ عبدالطیف، سچل، خواجہ فرید، بیدل بیکس، خوش خیر محمد، سید رکھیل شاہ اور اس کے بعد ان کے فرزند سید چیزل شاہ و دیگر نے اس سلسلے میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ سید رکھیل شاہ اور سید چیزل شاہ جس ارادت کے سلسلے سے ملے ہوئے ہیں وہ میراں پور جھوک کے حضرت شاہ عنایت شہید سے ملتا ہے اوپر چل کر حضور صلعم سے ملتا ہے۔ صوفیا نے انسانوں کو خدا کی جانب راغب کیا ہے اور محبت کے اس تلقین نے لوگوں کو انسان دوستی اور بے تعصبی پیدا کی۔ شاہ عنایت، سید رکھیل شاہ اور سید چیزل شاہ کے مریدین میں ہندوؤں کا بھی ہونا، اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ درویشی کا تسلسل ہے۔ ان کا کلام نہ صرف تصوف کے میدان میں بلند آہنگ ہے بلکہ شاعری کے روایت کے ساتھ فن و فکر کے مطابق بھی ربط میں ہے۔"

صوفی چیزل شاہ کے بارے میں امیر بخاری لکھتے ہیں۔

" صوفی رکھیل شاہ کے فرزند چیزل شاہ فتح پور میں پیدا ہوئے۔ چیزل شاہ کا کلام سندھی، سرائیکی، اردو اور فارسی زبان میں ہے۔ ان کے ابیات اور کافیوں میں خیال کی بلندیوں کے ساتھ فراق کا ایک بلند آہنگ بھی موجود ہے۔"

ان کی سندھی کافی کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

تیری الفت ہی دن رات
کرے نادان مجھے
پیر مغاں نے مجھ سے کہا ہے

مرنا جینا اثبات، ملا فرمان مجھے
عشق کے غم نے گھیرا ڈالا
جل گئیں شش جہات، ہوا نقصان مجھے
بے خود ہوکر، بحر میں ڈوبا
ریزوں کی اسمات، کریں نشان مجھے
"چیزل" سر ہے دار پہ آیا
سن یہ برہ کی بات ، سن سلطان مجھے

☆☆☆

صوفی فیض محمد المعروف فیضل فقیر لاشاری(1884-08-11-1957)

صوفی رکھیل شاہ کے مرید و طالب تھے۔ جنہوں نے بلوچی، سندھ، سرائیکی اردو، فارسی، براہوئی زبانوں میں اشعار کہے۔ ان کے متعلق الفت نسیم لکھتے ہیں:۔

" بلوچ خانہ بدوشانہ ثقافت کے ساتھ اپنے دامن میں تصوف اور روحانیت کا ایک خزینہ بھی رکھتا ہے۔ لیکن یہ ہماری نابودی اور کم ہمتی ہے جس کی وجہ سے ہم نے بلوچ معاشرے کے اس شعبے کی جانب توجہ نہیں دے سکے اور اس کے شعبے کے موتیوں کو ڈھونڈ نہیں سکے اور لوگوں کو ان کے روشن فرمودات سے آگاہ نہیں کر سکے شاہ سیر واہ کے مالک فیض محمد جو زیادہ تر فیضل فقیر لاشاری کے نام سے مشہور ہیں۔ ان موتیوں میں سے ایک

ہیں جن کے علم و دانش سے سندھ اور بلوچستان کے لوگ مستفید
ہوتے رہے ہیں۔ سندھ اور بلوچستان کے ولیوں اور صوفیوں میں
بلند مرتبہ کے مالک ہیں"۔

صوفی پہلوان فقیر ڈومکی(1939-07-1878,24)

صوفی پہلوان فقیر بھی صوفی رکھیل شاہ کے طالب ہیں۔ انہوں نے بھی سندھی، سرائیکی، بلوچی، فارسی، پنجابی زبانوں میں کلام کہے ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام "دعوت العشق" پہلی مرتبہ 1952ء دوسری مرتبہ 1984ء اور تیسری مرتبہ 2011ء میں چھپ چکا ہے۔ ان کا ایک کثیر الزبانی کلام یوں ہے

ے منہ منور محب کا حسن ہم کو نظر
ہم دوبارہ دوست کے دیدار کے لئے منتظر
صیف ابرو ہیں صفا مجگان محب کا تیز تر
چوک چشموں کا دیا مجھ کو لگا سینے اندر
زیب زیادہ شد زنخ لب سیم چون دندان زر
شعلہ جلوہ حبیبی روء را شعاع قمر
سہنڑل ء گفتار مجلس محب تھئ وشیں ہور
دوست کھٹیں دلبرء داثو وثی دوستیں سغر
تھیو سوالی "پہلوان" آیو پاند پائے دوست در
راز و رہبر ہی ڈھوسے باب آلِ پیغمبر

صوفی محرم فقیر لاشاری(1982-05-15/1918)

صوفی محرم فقیرؔ لاشاری صوفی فیض محمد المعروف فیضل فقیر کے فرزند تھے جنہوں نے سندھی، سرائیکی، بلوچی، براھوئی، اردو، فارسی زبان میں شاعری کی ان کا شعری مجموعہ "دیوان غیاث المشتاقین "2000 میں بگن فقیر دیناری سے ترتیب دیا جس کو عبدالغنی فقیر اور فقیر سکندر علی کھوسو نے شائع کرائی۔

فتح پور کے صوفیوں کے رسالہ جات جن میں صوفی رکھیلؔ شاہ کے رسالے "بحر العشق "صوفی چیزلؔ شاہ کے رسالے "بحر العمیق "صوفی فیضل فقیر کے رسالے "فیض العشق " اور صوفی محرم ؔفقیر لاشاری کے رسالے "دیوان غیاث المشتاقین " میں کلام کو مختلف سروں اور راگوں میں ترتیب دیا۔ صرف صوفی پہلوانؔ فقیر ڈومکی کے شائع شدہ رسالے "دعوت العشق " میں دکھائی نہیں دیتے ممکن ہے کہ ترتیب دینے والے نے یا شائع کرنے والوں سے یہ رہ گیا ہو۔ تاہم دیگر چاروں صوفیا کرام کے کلام میں سروں کے ساتھ ترتیب میں دیئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آغا سلیم شاہ عبدالطیف بھٹائی کے راگوں کے متعلق لکھتے ہیں:۔

> "شاہ سائیں نے اپنے کلام کو مختلف سروں یعنی راگوں میں ترتیب دیا۔ شاہ سائیں علم موسیقی کے بہت بڑے ماہر تھے۔ آپ نے سندھ کی قدیم موسیقی کے راگوں، سندھ اور ہند کے مشترکہ راگوں، عرب، ایران کے مروجہ راگوں کے ملاپ سے سندھی راگوں کے ایک نئے نظام کو جنم دیا۔ سندھی کی لوک داستانوں مثلاً عمر مارئی، مومل رانڑوں، لیلا چینسر کو جن میں مقامی انداز میں گایا جاتا تھا۔

آپ نے ان کو مستقل راگوں کا روپ دیا اور سندھ کے پیشہ ور اور
محنت کش کام کاج کرتے وقت جو سُر الاپتے تھے یا گیت گاتے تھے۔
آپ نے ان کو بھی مستقل راگوں کی شکل دی"۔

شاہ عبد الطیف بھٹائی کے کلام طرح فتح پور کے صوفیوں کے کلام میں سُر موجود ہیں جن میں صوفی رکھیل شاہ کے کلام شام کلیانڑ، تلنگ، ضُلو، جوگ، کوہیاری، بھیروی، بروو، بلاولی، پیلو، وہاگ، مانجھ، پہاڑی، لوڑاؤ، سورٹھ، کوئنسیو، آسا، صبوحی، دھنا سری، سہنڑی، سارنگ اور ٹوڑی سروں کے ترتیب میں ملتے ہیں۔ اسی طرح صوفی چیزل شاہ کے کلام میں شام کلیانڑ، تلنگ، پیلو، ضلو، بھیروی، جوگ، وہاگ، سہنڑی، کوہیاری، رانڑوں، لوڑاؤ، مانجھ، پہاڑی، صبوحی، ٹوڑی، بلاولی، سورٹھ، آسا، کلنگڑو، دھنا سری، بسونت راگوں کے ترتیب میں شاعری ملتی ہے۔ جبکہ فیضل فقیر لاشاری کا کلام آسا، لوڑاؤ، صبوئی، بلاولی، بھیروی، تلنگ، بروو، ضلو، پہاری، پیلو، سنہڑی، سورٹھ، ٹوڑی، کوہیاری، جوگ، مانجھ، رانڑوں، دھناسری، شام کلیانڑ کے ترتیب میں ملتے ہیں۔ یونہی صوفی محرم فقیر کا کلام شام کلیانڑ تلنگ، جوگ، کوہیاری، بھیروی، لوڑاؤ، پہاڑی، مانجھ، سورٹھ، رانڑوں، آسا، بلاولی، دھناسری، سارنگ، صبوحی، سنہڑی سروں اور راگوں کی لڑی میں پروئی ہوئی نظر آتی ہیں۔ شاہ لطیف کہتے ہیں۔

؎ وہ ہی سچے صوفی تھے جو، سب سے تھے بیگانے
عشق کی بازی بھول نہ پائے، ایسے تھے فرزانے
مستی سے مستانے، پاگئے اپنا پریتم

اس تحریر میں درگاہ فتح پور شریف گنداواہ، ضلع جھل مگسی کے صوفیوں سید رکھیل شاہ اور سید چیزل شاہ، درگاہ فیض پور، تحصیل گنداخہ ضلع جعفر آباد سے تعلق رکھنے والے سید رکھیل شاہ کے طالب فیض محمد المعروف فیضل فقیر اور ان کے فرزند ارجمند صوفی محرم فقیر لاشاری اور رندواہی جیکب آباد سے تعلق رکھنے والے سید رکھیل شاہ کے طالب صوفی پہلوان فقیر ڈومکی کا اردو کلام کا نمونہ اور ان کے متعلق مختصر حالات زندگی ان کے رسالوں سے لکھ کر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ سید رکھیل شاہ 1846ء میں پیدا ہوئے اور سب سے کم عمر صوفی محرم فقیر 1982ء میں اپنے ابدی قیام گاہ کی جانب راہی ہوئے۔ درگاہ فتح پور قدیم کچھی میں واقع ہے۔ کچھی کے لوگ بہ یک وقت بہت سی زبانیں بولتے ہیں۔ یہاں پر بلوچی، براہوئی، سندھی، سرائیکی بولی جاتی ہیں ۔زمانہ قدیم میں فارسی سرکاری زبان رہی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اردو سرکاری زبان ہے جبکہ ذریعہ تعلیم بھی ہے، اس لئے ان صوفیا کے کلام میں ان تمام زبانوں کا آہنگ ملے گا۔ اگر وہ اردو میں کلام کہتے ہیں تو فارسی، سندھی سرائیکی اور بلوچی کی آمیزش کے ساتھ ہوگی اسی طرح سندھی کا کلام میں بھی دیگر زبانوں کی ملاوٹ خوبصورتی کے ساتھ ہوگی۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ یہاں کے لوگ جب اپنی مادری زبان میں بات کرتے ہیں تو اپنے ہمسایوں کی زبان کے الفاظ ایسے استعمال کرتے ہیں جیسے وہ ان کی زبان ہو ۔حتیٰ کہ دودسری زبانوں کے ضرب المثل کو اپنے گفتار کا حصہ بناتے ہیں۔ یہ صورت حال یہاں کے لوگوں کی کشادہ ذہن اور وسیع القلبی کو واضح کرتے ہیں۔ صدیوں سے آباد قبائل نے ایک دوسرے کی زبان کو اس طرح سے اختیار کیا ہے جیسے یہ سب

زبانیں ان کی اپنی ہوں۔ سب سے پیار کے موتی جھڑتے ہوں۔ ان موتیوں کا حقیقی اظہار یہاں کے صوفی بزرگان نے بھی اپنے کلام میں کیا ہے۔ وہ ایک کلام میں بہ یک وقت بہت زبانیں استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جس کی مثال ہمیں فتح پور کے تمام صوفی بزرگان میں بکثرت نظر آتے ہے۔

حوالہ جات:

1۔ آغا سلیم۔1990۔ شاہ جو رسالو۔ لوک ورثہ۔ اسلام آباد

2۔ڈاکٹر عبدالرزاق صابر۔۔۔

3۔ عبدالرحمن غور۔ نغمہ کوہسار۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

4۔ سید رکھیل شاہ 2007 (ساتواں) بحر العشق۔ آزاد کمیونیکشنز کراچی

5۔ سید چیزل شاہ۔2004 (اشاعت سوئم) بحر العمیق۔ آزاد کمیونیکشنز کراچی

6۔ الفت نسیم۔ شاہ سیر واہ۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

7۔ صوفی پہلوان فقیر۔ 2011 (اشاعت سوئم) آزاد کمیونیکشنز کراچی

8۔ صوفی محرم فقیر۔2006۔ دیوان مشتاقین۔۔۔۔

9۔ فیضل فقیر۔ ندارد۔ فیض العشق۔ مسودہ

بلوچستان میں بزگر تحریک

بلوچستان تین لاکھ سینتالیس ہزار ایک سو نوے(347,190)مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا پاکستان کے تقریباً چوالیس (44٪) رقبے پر مشتمل صوبہ ہے۔ جس کی پانچ اعشاریہ نو(5.9٪) رقبہ قابل کاشت اراضی ہے اور باقی ماندہ علاقہ ناہموار پہاڑیوں، دامنوں اور چراگاہوں پر مشتمل ہے۔ قابل کاشت اراضیات کو لُڑ آف یعنی بارش کے پانی اور سیاہ آف یعنی مستقل پانی کے ذرائع یعنی چشموں، کاریزوں، نہری پانی اور ٹیوب ویل کے ذریعے آباد کیا جاتا ہے۔ جن کو مالکان خود یا بزگر تابع مرزی، بزگر لٹھ بند، بزگر موروثی، بوہروئی، پتی اور روزانہ اجرت کی شکل میں موجود کاشت کار یعنی بزگر آباد کرتے ہیں جن کو مختلف علاقوں میں دوازدہک، دہک، ہشتگ، ششک، چیارک، سیّک، نیم اور دہاڑ کی شکل میں اجرت ملتی ہیں یعنی(بارہواں، دسواں، آٹھواں، چھٹے، چوتھے، تیسرے، نصف حصے اور دہاڑی کے شکل میں معاوضہ ملتا ہے)۔

بلوچستان میں زمانہ قدیم سے اکثر اراضیات مشترکہ رہی ہیں اور ایک شخص، فرد، حاکم کی ملکیت کے بجائے قبائل کی مشترکہ اراضیات ہوا کرتی تھیں۔ چراہ گاہیں اور جنگلات بھی شاملات یعنی مشترکہ اراضیات کہلاتی رہی ہیں۔ ڈاکٹر عنایت اللہ بلوچ اپنی کتاب میں نوری نصیر خان والیءِ قلات کے دور حکومت (1749-1994) کے دوران بلوچستان میں چار اقسام کی اراضیات کا ذکر کرتے ہیں، جس کی تفصیل یوں ہے۔

قومی اراضیات

یہ زمینیں قبائلی صوبوں میں واقع ہوتی تھیں اور مشترکہ اراضیات ہوا کرتی تھیں جنہیں کوئی بھی نہیں، حتیٰ کہ قبیلے کا سردار بھی نہ بیچ سکتا تھا نہ ہی رہن رکھ سکتا تھا۔ بلوچ روایات کے مطابق اس زمین پانچواں حصہ قبائلی سردار کو منظم اور سپہ سالار کی حیثیت سے مہمان خانے کے انتظام وانصرام کے غرض سے دیا جاتا تھا اور باقی ماندہ زمین قبیلے کے ہر فرد کو بانٹا جاتا تھا۔ غلاموں اور لوڑیوں کو حصہ نہیں ملتا تھا۔ حصہ داروں کی جانب سے خود کاشت نہ کرنے کی صورت میں وہ اراضی دہواروں اور جٹّوں کو ٹھیکے پر دیا جاتا اور اس کی پیداوار قبیلے کے مرد ممبران میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہ اراضیات پانچ یا دس سال کے بعد دوبارہ تقسیم کی جاتی تھیں۔

جاگیر

محصولات اور ٹیکس سے مبرا یہ اراضی ہر قبیلے کو فوجی یا دیگر خدمات کے عوض عطا کی جاتی تھی۔ قبیلے کے سربراہوں کو اجازت ہوتی تھی کہ زمین کی آمدن کا چھٹہ حصہ (ششک) اپنی ضروریات کے لئے لے سکتے تھے۔ جب یہ زمین ایک بار تقسیم بطور جاگیر کر دی جاتی تھی تو اس کی آمدنی سے ریاست کو کوئی محصول جمع نہیں ہوتی تھی اس اراضی کو بھی "قبیلے کے سردار سمیت کسی فرد کو فروخت کرنے یا رہن رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔

غمی اراضیات

یہ اراضیات قبیلے کے فوجی طاقت کو مد نظر رکھتے ہوئے جنگی استطاعت کے

مطابق دی جاتی تھی۔ قبیلے کے سربراہ پر لازم تھا کہ ان اراضیات کی پیداوار کا بارہواں حصہ جمع کر کے ریاست کے خزانے میں جمع کرائے۔ یہ زمین قبیلے کے مرد ممبران میں یکساں طور پر تقسیم کیا جاتا تھا۔ قبیلے کے کسی فرد حتیٰ کہ سردار کو بھی یہ اراضیات کو فروخت کرنے یا رہن رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ فوجی خدمات کی سرانجامی میں کوتاہی یا دیگر نافرمانی کے شکل میں خان کو حق حاصل تھا کہ وہ یہ زمین ضبط کر سکتا تھا۔

خانی اراضیات

یہ اراضیات شاہی اراضیات بھی کہلاتی تھی جو کہ خان کی ملکیت ہوتی تھیں جنہیں دہوار (تاجک) جٹ (ہندوستانی) اور افغانیوں کو مستقل طور پر کاشت کے لئے دی جاتی تھیں جس کی آمدن براہ راست ریاست کے خزانے میں جمع ہوتی تھی اور یہ مزارعے فوجی خدمات سے مبرا ہوتے تھے، قبیلوں کی جانب سے فوجی خدمات و دیگر احکامات کی عدم عدولی کے باعث ضبط ہونے والی اراضیات بھی ان کو آباد کرنے کے لئے دیئے جاتے تھے۔ کچھی کے جٹ بزگروں سے نصف پیداوار، شال (کوئٹہ) کے افغان، مستونگ، قلات کے دہواروں داجل اور ہڑند کے جٹ بزگروں سے ایک تہائی، مکران، چاغی اور خاران وغیرہ بزگروں سے آٹھواں، دسواں، اور بارہواں حصہ لیا جاتا تھا۔(1)

بلوچستان میں مختلف علاقوں میں مختلف ذرائع سے مختلف اقسام کے اراضیوں کو آباد کرنے کے عوض کسانوں کو جو معاوضے ملتے تھے جن کا تذکرہ پہلے کیا گیا ہے تاہم اس کی تفصیل یوں ہے:

1۔ دوازدہک: اس میں کسان غمی اراضیات کو آباد کرتا تھا۔ اس کی لٹھ بندی، ہل، تخم، سمیت تمام مزدوری کرتا تھا، گیارہ حصے کسان کے ہوتے تھے جبکہ بارہواں حصہ مالک کا ہوتا تھا کسان کی اجازت کے بغیر زمین بیچ نہیں سکتا بلکہ اس کی مرضی سے بیچنے پر اس کا حصہ دیتا ہے۔

2۔ دہک: اس میں بھی موروثی بزگری کے شکل میں کسان زمین کی لٹھ بندی، ہل، تخم، سمیت تمام مزدوری کرتا تھا نو حصے کسان کو ملتے تھے اور دسواں حصہ مالک کا ہوتا تھا تاہم وہ بزگر کی مرضی کے بغیر زمین فروخت نہیں کرسکتا، بلکہ حصہ دیتا۔

3۔ ہشتک: اس میں بھی موروثی بزگر ہوتے ہیں جو اراضی کی لٹھ بندی کرتے ہیں۔ ہل چلاتے ہیں۔ بیج ڈالتے ہیں کٹائی کرتے ہیں سات حصے بزگر کے ہوتے ہیں آٹھواں حصہ مالک کو دیا جاتا ہے۔ وہ بزگر کی مرضی کے بغیر زمین بیچ نہیں سکتا بلکہ اسے حصہ دیتا ہے۔

4۔ ششک: اس میں موروثی بزگر اراضی کے مالک کے زمین سے لے کر اس کی لٹھ بندی کرتا ہے اس میں بیج ڈالتا ہے۔ ہل چلاتا ہے۔ دیکھ بھال کرتا ہے۔ پانچ حصے بزگر لے جاتا ہے ایک حصہ مالک کا ہوتا ہے مالک بزگر کی اجازت کے بغیر زمین بیچ نہیں سکتا۔

5۔ چیارک: اس میں بزگر مالک سے اراضی لے کر اسے قابل کاشت بناتا ہے، اس کی لٹھ بندی کرتا ہے، آباد کرتا ہے، تخم ڈالتا ہے، کٹائی کرتا ہے، تین حصے بزگر کے ہوتے ہیں ایک مالک کا ہوتا ہے یہاں بھی مالک بزگر کی مرضی کے بغیر زمین بیچ نہیں

سکتا۔

6۔ سیّک: اس میں بھی چیارک کی طرح لٹھ بندی سے کٹائی تک بزگر کرتا ہے لیکن وہ دو حصے اٹھاتا ہے اور ایک حصہ مالک کا ہوتا ہے یہاں بھی زمین بیچنے کے لئے کسان کی اجازت ضروری ہوتا ہے۔

7۔ نیم: اس میں مالک زمین کے ساتھ پانی، بیج، کھاد دینے کا پابند ہوتا ہے کسان پر ہل، دیکھ بھال اور کٹائی ہوتا ہے۔ پیداوار آدھا آدھا تقسیم ہوتا ہے۔ یہاں مالک زمین بیچ سکتا ہے۔ سال بہ سال معاہدہ ہوتا ہے تاہم کھڑی فصل کے دوران بزگر کو نکال نہیں سکتے۔

8۔ چارمی: ٹیوب ویل کے اراضیات کو آباد کرنے کے لئے زمین، پانی، بجلی، کھاد مالک کا ہوتا ہے۔ ہل، دیکھ بھال اور کٹائی بزگر کرتا ہے تین حصے مالک کے ہوتے ہیں، جبکہ ایک حصہ بزگر کا ہوتا ہے۔

9۔ بوہروئی: زمین مالک کا ہوتا ہے وہ اسے بزگر کو اس شرط پر دیتا ہے ایک معیّن مقدار میں غلّہ اسے دے گا۔

10۔ پتّی: بزگر جب مالک کی زمین کو کاشت کرتا ہے لیکن کھیت علاقے کا فصل مالک کو تحفے کے طور دیتا ہے۔

11۔ کندھوئی: بزگر بیل لاتا ہے اسے ہل میں استعمال کرتا ہے اس کا معاوضہ ایک خاص معیّن مقدار میں غلّہ لیتا ہے۔

12۔ دیہاڑی: روزانہ اجرت پر کام کرنے والے بزگر بھی موجود ہیں خاص طور

پر فصل کی بوائی اور کٹائی کے دوران ان کی ضرورت پڑتی ہے۔

بلوچستان میں کسانوں کی تحریک کا اگر جائزہ لیا جائے گا تو ہمیں سولہویں صدی میں جھالاوان کے ایک علاقے میں بٹائی یا جاگیر دار کے حصے کی شرح میں کمی کے بارے میں ایک جدوجہد کا تذکرہ ملتا ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر شاہ محمد مری لکھتے ہیں۔

" بلوچوں میں بھی قبائلی نظام کے ساتھ ساتھ (اس کے بطن سے) فیوڈل نظام پروان چڑھتا رہا اور قبائلی نظام میں رہتے ہوئے بھی کسان بغاوتیں نمودار ہوتی رہیں۔ سر قبیلوی نظام کے آقا نے اپنے انتظامات کے ذریعے ان کسانوں کے بغاوتوں کا ذکر کتابوں، محاوروں اور شاعری سے پرے رکھا۔یوں بے شمار کسان مزاحمتیں بلانوٹس و تذکرہ وقت کی دھند بھی گم ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ایک کسان تحریک آج سے پانچ صدی قبل 1574 میں چلی تھی جو کہ بٹائی کی شرح میں کمی کے مطالبے سے شروع ہوئی تھی۔ "جالاریں کرخا" کے علاقے سے شروع ہوئی اس بغاوت کی قیادت سومار رکھیا کر رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے یہ تحریک سندھ تک پھیل گیا جاگیر داروں نے خان قلات کو مدد کے لئے پکارا۔ چنانچہ 1974 میں امیر سنجر نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی میرو کے ساتھ ایک بڑا لشکر "جالاریں کرخا" بھیج دیا۔ سخت لڑائی ہوئی کسانوں کا لیڈر سومار جنگ میں مارا گیا اور کسان تحریک کچل دی گئی۔(2)" عادل رشید لکھتے ہیں:۔

حلال رزق کا مطلب کسان سے پوچھو

پسینہ بن کے بدن سے لہو نکلتا ہے

سولہویں صدی کے اس کسان بغاوت کے بعد بلوچ تاریخ کے جھرونکوں سے ہمیں بیسویں صدی کے آغاز میں جدید سیاسی جدوجہد کے آغاز میں ریاست قلات میں حکمرانوں کے ناانصافیوں اور چیرہ دستیوں کو بے نقاب کرنے اور شعوری جدوجہد کا آغاز، 1920 میں میر عبدالعزیز کرد کرتے ہیں۔ انجمن اتحاد بلوچستان کے پلیٹ فارم سے عملی طور پر ریاست قلات کے جابر وزیراعظم سر شمس شاہ کے سیاہ کارناموں اور چیرہ دستیوں کے خلاف 20 نومبر 1931 کو میر یوسف عزیز مگسی اور میر عبدالعزیز کرد کے دستخط سے ''شمس گردی'' کے نام سے وائٹ پیپر کی اشاعت لاہور سے کی جاتی ہے۔ جس میں بھی کسانوں پر ہونے والے مظالم کا تذکرہ ملتا ہے جن کو ڈاکٹر سلیم کرد یوں واضح کرتے ہیں:

1۔ تمام منہدم شدہ اراضیات و کاریزات سے برابر مالیلہ وصول کیا جاتا تھا۔

2۔ مقدمات آب واراضی میں کورٹ فیس وصول ہونے کے باوجود متنازعہ پیداوار کو روکنے کے واسطے تین روپے فی صدی مزید معاوضہ وصول کیا جاتا تھا۔ حالانکہ اس قسم کے اجناس کو سرکاری تحویل میں رکھا بھی نہیں جاتا، بلکہ دکانداروں کے پاس امانتاً رکھا اور ان کو بھی کوئی معاوضہ نہیں دیاجاتا تھا۔ اس قسم کی عائد شدہ فیس شاہی نظام حکومت میں پہلے بالکل نہیں تھی بلکہ یہ شمس شاہ کی مہربانی ہے چونکہ اس فیس کا تعلق آب واراضی کے مقدمات سے ہے اس لئے اس کا بوجھ بھی کاشتکاروں کے مظلوم طبقے پر پڑا۔

3۔ موسم خزاں میں باغات میں برگ ریزی کے موقع پر پہلے مالیہ مقرر نہ تھا۔

وزیر اعظم سر شمس شاہ نے برگ ریزی پر نیا محصول لگا کر کاشتکاروں پر احسان کیا۔

4۔ ایستادہ فصلات، آلو، پیاز وغیرہ پر بھی محصول جمعداری کے نام سے ایک نیا ٹیکس لگایا گیا جو اس سے قبل کھڑی فصلات پر بالکل نہیں تھا۔ صرف اس پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے لئے محصول جمعداری کے حق کو ٹھیکہ پر دینے کے لئے بولی شروع کی گئی اور اس بولی کو لالچ میں ملتوی کر کے طول دیا جاتا تھا کہ حتیٰ کہ کھڑی فصلیں تباہ ہو جاتی تھیں۔ لیکن نیلامی محصول ختم ہونے کو نہیں آتی تھی۔

5۔ کچھی کے بعض علاقہ جات میں نیلی دسمہ اور کپاس پر وزیر اعظم نے خاص محصولات لگا کر کاشتکاروں کی کمر توڑ دی جس کے نتیجے کے طور پر کاشت بند ہوئی اور پیداوار مفقود ہوئی۔

6۔ نادار اور مفلس کاشتکاران جو کاریزات کے انہدام اور اراضی ریگ برد ہونے سے نان شبینہ سے محروم ہو گئے تھے ان کاشتکاروں کو ان غیر آباد اور برباد شدہ آب واراضی کے مالیہ کے واسطے بری طرح مظالم تختہ مشق بنایا گیا اور مالیہ کی وصولی کے لئے ان کاشتکاروں اور ان کے عزیز واقارب کو زیر حراست رکھ کر دوران حراست انہیں خوراک بھی نہیں دی جاتی تھی بلکہ کھانا پینا زیر حراستی پر تھا۔

7۔ مالیہ اور جرمانہ کے علاوہ حراستیوں سے بیگار بھی لی جاتی تھی، مالیہ اور جرمانہ نہ دینے پر گھر کا سامان نیلام کر کے معاشی نقصان پہنچا کر مفلوج کر دیا جاتا۔ (3)

سر شمس کے دور حکومت میں ریاست کی معیشت کو تباہی کی طرف لے جایا گیا بلکہ ریاست اور عوام کے درمیان دوریاں پیدا کرنے میں کوئی کسر چھوڑی نہیں

گئی، لیکن ہمارا موضوع بحث کسانوں پر ہونے والے مظالم ہیں جس کا تذکرہ ڈاکٹر شاہ محمد مری یوں لکھتے ہیں۔

"سڑکوں پر پانی چھڑکنے کا کام بیگاری کے طور پر کسانوں سے کرایا جاتا تھا، جب وزیر اعظم یا کسی دوسرے افسر کا دورہ باہر علاقے میں نکلتا تو عمارت اور احاطہ جات سرکاری اور سڑکوں کی صفائی و درستی کا کام بھی بطور بیگار کسانوں سے کرایا جاتا تھا یا جب کبھی بڑا انگریز حاکم حدودِ ریاست میں مدعو کیا جاتا تھا تو اس کو خوش کرنے کے واسطے تزئین و آرائش کا جس قدر انتظام کیا جاتا وہ تمام بیگار پر مفت کرایا جاتا"۔(4)

انجمن اتحاد بلوچستان کی جدوجہد رنگ لاتی ہے خان محمود خان کی فوت ہو جاتے ہیں سر شمس شاہ انگریزوں کے تعاون سے محمود خان کے بیٹے محمد انور کو مسند قلات پر بٹھانے کی تگ و دو میں لگ گئے اور انجمن اتحاد بلوچستان میر یوسف عزیز مگسی کی سربراہی میں محمود خان کے بھائی میر اعظم جان کی حمایت کرتے ہیں۔ یوں پہلی مرتبہ والی قلات سیاسی تحریک اور مداخلت کے باعث بنتے ہیں جس کی وجہ سے سر شمس شاہ برطرف ہوئے لیکن مسند پر تخت نشین ہونے کے بعد خان اعظم خان کے تیور بدل جاتے ہیں اور وہ بھی روایتی حکمران کی روپ دھار لیتے ہیں۔ انجمن بلوچستان میں شعوری جدوجہد کا کاروان لے کر آگے بڑھتا ہے۔ تین روزہ آل انڈیا بلوچ کانفرنس مورخہ 27 دسمبر 1932 میں جیکب آباد منعقد ہوتا ہے جس میں بھی بلوچستان کی اقتصادی زبوں حالی کے پیش نظر مالیہ میں پچاس فی صد رعایت، کسانوں کی مالی امداد، ہندوستان سے مقامی منڈیوں تک میوہ جات کی آمد کو روکنے، غیر ملکیوں

کو غیر زراعت پیشہ افراد کو اراضیات کی منتقلی کو روکنے اور غیر ملکی جانوروں کے چراہ گاہوں کے استعمال کرنے کی پابندی جیسے مطالبات پیش کئے جاتے ہیں۔ جدوجہد جاری رہتی ہے پھر کسانوں کا منظم جدوجہد ہمیں قیام پاکستان کے بعد ایوب خان کے دور میں پٹ فیڈر کے علاقے میں ملتا ہے۔

انیسویں صدی کے نامور شاعر تاج محمد تاجل کچھی میں بزگروں کی صورتحال کو دیکھ کر جاگیرداروں کو یوں کوستے ہیں۔

تم اگر انسان ہوتے
صاحب ایمان ہوتے
پاک پروردگار کی قسم
ہرگز نہ کرتے یہ ستم!
وہ بھی تو انسان ہیں
تو یہ حیوانی سلوک
اس پر ستم فاقہ و بھوک
حیران ہوں کہ روز جزا
تم کو ملے گی کیا سزا؟(5)

پٹ فیڈر تحریک

ایوب خان کے دور میں پٹ فیڈر کینال کی تکمیل ہوتی ہے یہاں کی زرخیز زمین کو زمانہ قدیم سے آباد قبیلوں کے بجائے غیر مقامی انتظامیہ نے غیر مقامی لوگوں

کو دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ مختلف وجوہات، حیلوں اور بہانوں وعذرات کے ذریعے زبردستی پنجاب سے لائے گئے لوگوں کو آباد کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔ ملک میں آباد اقوام میں نفرت کی بیج بونے اور ان کے درمیان خلیج پیدا کرنے کی باقاعدہ سازش کا آغاز کیا گیا۔ ون یونٹ انتظامیہ مقامی افراد کو بے دخل کرکے پنجابیوں کو اراضی دے کر بزور طاقت آباد کر رہے تھے۔ بلوچستان مفلوک الحال عوام اس کے خلاف تھے یہ کام نہ صرف بلوچستان میں ہو رہا تھا بلکہ سندھ میں بھی یہی عمل جاری رکھا گیا یوں نفرت کی دیواریں کھڑی ہونے شروع ہوئیں جن کے بارے میں محمد رمضان یوں لکھتے ہیں۔

" بلوچستان اور سندھ کے لوگ مختلف علاقوں سے آئے ہوئے کسان پنجابیوں کے خلاف اس لئے نفرت کا اظہار نہیں کر رہے تھے کہ وہ پنجابی زبان بولتے تھے بلکہ اس لئے نفرت کرتے تھے کہ پنجابی آبادکار ون یونٹ کی انتظامیہ کی طاقت سے پٹ فیڈر میں آباد ہوئے تھے۔ نہری زمین حاصل کرکے مقامی آبادی کے خوشحالی کے وسائل پر قابض ہوگئے تھے"۔(6)

بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی مقبول پارٹی(نیشنل عوامی پارٹی) تھی جو بلوچستان کے زمینی اور دیگر قدرتی وسائل پر وہاں کے عوام کے حق کے حصول کی جدوجہد میں مصروف عمل تھی، وہ ون یونٹ انتظامیہ کی جانب سے پٹ فیڈر میں غیر مقامی افراد کی آبادکاری کے مخالف تھی۔ ون یونٹ کا خاتمہ ہوا۔انتخابات ہوئے بلوچستان میں(نیشنل عوامی پارٹی) مقبول پارٹی کے شکل میں ابھری اور صوبائی

حکومت (نیشنل عوامی پارٹی) کی بن گئی تو اس دوران مقامی کسانوں اور پنجابی آباد کاروں کے درمیان پٹ فیڈر کے علاقے میں جھڑپیں ہوئیں۔ مقامی کسانوں کے مدد کے لئے قریبی علاقوں کے قبائلی لوگ بھی متحرک ہوئے یوں پنجابی آباد کاروں کے رہنما تاج محمد کا قتل ہوا، صوبائی اور وفاقی حکومت کے درمیان جو چپقلش پہلے سے موجود تھی موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے سیاسی تضادات کو مزید ہوا دینے کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ پنجابی آباد کار پٹ فیڈر سے نقل مکانی کرنے لگے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی وفاقی حکومت نے صوبائی حکومت کو پنجابیوں کو تحفظ نہ دینے کا ذمہ دار قرار دے کر حکم نامہ جاری کیا ہے کہ پٹ فیڈر کے علاقے سے پنجابی آباد کاروں کو بحفاظت نکالا جائے۔ ان کے قبضے میں موجود زرعی زمینوں، ان پر اُگی ہوئی فصلوں اور گھروں کی تعمیر کے اخراجات کا تخمینہ لگا کر ان کے کلیم بنائے جائیں۔ حکومت بلوچستان اور حکومت پاکستان باہمی تعاون سے فصلات، مکانات اور اراضیات کا معاوضہ دے کر انہیں چولستان میں زرعی زمین دے کر آباد کرنے میں تعاون کرے گی۔

بلوچستان میں زرعی اصلاحات اور ششک تحریک

بلوچستان میں (نیشنل عوامی پارٹی) حکومت اور وفاق میں پیپلز پارٹی کے حکومت کے درمیان اختلافات تو روز اول سے ہی پیدا ہو چکے تھے، بلوچستان میں زمانہ قدیم سے قائم بٹائی کے حصے دوازہک، دہک، ہشتک، ششک، چیارک، سے یک، نیم وغیرہ کا نظام زمانہ قدیم سے رائج تھا اور زمین قبیلے کی ملکیت ہوا کرتا تھا۔ پٹ فیڈر واقع اور (نیشنل عوامی پارٹی) مخالفت کو بنیاد بنا کر قیام پاکستان کے بعد بلوچستان سے

ابھرنے والی پہلی سیاسی جماعت (نیشنل عوامی پارٹی) اورسیاسی تحریک کوسردار دشمنی کارنگ دے کر بلوچ رہنماؤں اور مفلوک الحال عوام کے درمیان خلیج پیدا کرنے کے لئے "ششک" کے خاتمے کا اعلان کیا۔یوں بلوچستان کے جمہوری حکومت کو غیر جمہوری ہتھکنڈوں کے ذریعے غلط معلومات کی بنا پر ختم کرنے کے عمل کو ملک کے دیگر علاقوں میں جائز قرار دلوانے کی چال کامیاب ہوئی۔ ذوالفقار علی بھٹو 1976 میں اس بارے میں تقریر کی۔ احمد سلیم ایک تقریر میں بھٹو کے بلوچ سرداروں کے بارے میں خیالات کو یوں واضح کرتے ہیں۔

" سرحد میں عشر کو ختم کیا گیا۔اس کے بعد زرعی اصلاحات ہوئیں، ہر شخص کی زمین کو کاٹنا پڑا۔ ہر شخص کی زمین کو کم کرنا پڑا۔ سارے ملک میں لوگوں نے فارم پُر کرنے کی تحریری کارروائی کی۔ بلوچستان کے سرداروں نے زرعی اصلاحات کے فارم پُر نہیں کئے۔ اتنی مغروری، اتنی لاپرواہی کہ قانون کے سارے ملک کے لئے ہے۔ قانون ساری دنیا کے لئے ہے لیکن سرداروں کے لئے نہیں، اور انہوں نے کہا کہ ہم فارم نہیں بھرتے۔ یہاں زرعی اصلاحات نہیں ہوں گی ۔زرعی اصلاحات کس کے حق میں تھیں؟میں خود تو زمین نہیں لے رہا تھا۔میرے دوست نہیں لے رہے تھے۔ یہ زمین بانٹنے والی تھی۔ تقسیم ہونے والی تھی۔ غریبوں میں! بلوچوں میں، پٹھانوں میں اور بروہیوں میں! بائیس سرداروں نے اب تک فارم نہیں بھرے ہیں۔ زرعی اصلاحات کے۔ توجناب، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سارے ملک میں زرعی اصلاحات ہوں۔ بلوچستان میں اصلاحات نہ ہوں؟ بلوچستان کے سردار

کیا قانون سے بھی اونچے ہیں؟ کیا ان کا درجہ اتنا اُونچا ہے؟ اتنا چوٹی کا درجہ ہے۔ قانون آپ کے لئے، میرے لئے، ساری دنیا کے لئے ہے لیکن ان برہمنوں کے لئے قانون بھی نہیں اور زرعی اصلاحات بھی نہیں؟ زرعی اصلاحات ہوں گی خواہ یہ کتنے بھی تاؤ لگائیں اپنی مونچھوں پر"۔(7)

اس وقت بھٹو کی تقریر میں بائیس سرداروں کی جانب سے زرعی اصلاحات کے فارم نہ بھرنے کا تذکرہ ملتا ہے، چار دہائیوں کے گزرنے کے بعد جنرل مشرف نے بھی اپنی تقریر میں صرف تین سرداروں کو ترقی کا دشمن قرار دیا تھا۔ کیا بھٹو دور میں ان کے اپنے صفوں میں شامل سرداروں کے علاقے میں زرعی اصلاحات ہوئیں؟ کیا مشرف کے دور میں ان کے حمایتی ایک سو سے زائد سرداروں کے علاقے دودھ وشہد کی نہریں بہائی گئیں؟ لوک کہتے ہیں بھٹو جب بلوچستان کے سابق دارالحکومت قلات میں بلوچستان میں زرعی اصلاحات کرنے، مالک کے بٹائی حصے "ششک" کے خاتمے اور سرداری نظام ختم کرنے کا اعلان کر رہے تھے تو وہاں اسٹیج پر اس کے ساتھ براجمان سردار دوداخان زرکزئی نے اٹھ کر سوال کیا آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ تو انہوں نے برجستہ طور پر جواب دیا کہ آپ کو عوامی سردار ہیں یہ آپ پر لاگو نہیں ہے۔ بلوچستان میں ظلم وجبر، ناانصافیوں، چیرہ دستیاں، محرومیاں! اسی طرح کی سرکاری، عوامی اور ترقی مخالف سرداروں کے سیاسی گھن چکر کی وجہ سے طول پکڑتی گئیں۔ بھٹو دور میں سرکار کی سرپرستی میں بلوچستان میں سیاسی عمل کو جس طرح سے مسخ کرنے کی کوشش ہوئی اس کی نظیر نہیں ملتی پھر ہر دور میں یہی عمل دہرا کر

بلوچستان میں قبائلی رجحانات کو تقویت دینے کی بھرپور کوششیں ہوتی رہی ہیں جس کی وجہ سیاسی عمل پھل پھول نہیں سکا جس کا خمیازہ اب تک سیاسی کارکن اور عوام بھگت رہے ہیں۔

پٹ فیڈر تحریک دوسرا دور میں

بھٹو دور میں پٹ فیڈر کے جاگیرداروں نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد کسانوں کو بے دخل کرنے کے لئے مختلف حربے استعمال ہونے لگے، جھڑپیں ہوئیں، سازشیں کی گئیں اور مزاحمتیں بھی ہوئیں، جاگیردار اور کسان دونوں کی قبائلی پس منظر کی وجہ رسہ کشی طول پکڑتی گئی، ملک میں بھی سیاسی صورتحال بدلنے لگی۔ پی این اے کی تحریک ودیگر عوامل کے باعث "جنرل ضیاء الحق" کے دور حکومت میں قبائلی سرداروں، خانوں، وڈیروں کو ذوالفقار علی بھٹو کی غلط حکمت عملیوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھٹو دشمنی اور ذاتی مفادات کے دام میں پھنسا کر کنٹرول کر لیا گیا تھا۔ باقی زرعی اصلاحات کے ذریعے ملنے والی زمینوں کے مالک کسانوں کو زمینوں سے بے دخل کرکے ان سے زرعی زمینوں کا قبضہ واپس لینا ضروری تھا، اس لئے جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے یہ عمل پٹ فیڈر سے شروع کروایا اور پھر پورے ملک میں اس حکمت عملی پر عمل کرنا تھا۔ جنرل ضیاء الحق کی حکومت کی حکمت عملی میں قومی صنعتوں کو نجی ملکیت میں دے کر اپنے اتحادی سرمایہ داروں کو مضبوط کرنا۔ زرعی اصلاحات میں کسانوں کو دی گئی زمینوں کو واپس لے کر جاگیرداروں کو دینا اور قبائلی جھگڑے کروا کر اپنے اتحادی سرداروں کے لئے راہ ہموار کرنا تھا"۔ (8)

پٹ فیڈر کے کسان پہلے بھی انتظامیہ کی جانب سے عدم تعاون کا شکار تھے۔ پھر نئی حکومت میں جاگیر داروں کی شمولیت نے ان کے حوصلوں کو پست کرنا شروع کر دیا۔ کسانوں کی اکثریت نے جاگیر داروں کی حقوق مالکانہ کو قبول کر کے انہیں بٹائی دینا شروع کیا، کچھ کسان اپنے نام پر الاٹ شدہ اراضیات کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ کچھ کسانوں نے نصف بٹائی دینے سے انکار کیا پھر اکٹھے ہو کر قانونی جدوجہد کا راستہ اختیار کیا۔ اسسٹنٹ کمشنر اور ڈپٹی کمشنروں کی عدالتوں نے جاگیر داروں کے حق میں فیصلہ دیا ۔کسان ہائی کورٹ پہنچ گئے ۔ہائی کورٹ نے کسانوں کے حق میں فیصلہ دیا۔ لیکن حکمرانوں کی صف میں شامل جاگیر داروں نے عدالتی حکم پر عملدرآمد ہونے میں رکاوٹ بنے رہے۔ اس دوران وہ کسانوں کو قبائلی جرگوں اور حربوں کے ذریعے بے دخل ہونے کے لئے حربے استعمال کرتے رہے۔ کسانوں کے صف میں دراڑیں ڈالنے کی بھرپور کوشش کرتے رہے۔ ناکامی کے بعد 20 دسمبر 1977 کسان تحریک کے متحرک رہنماء میر گل موسیانی کے گاؤں پر جاگیر داروں نے حملہ کروادیا یوں 21 اور 22 دسمبر کی رات کو کسانوں اور حملہ آوروں کے درمیان جنگ چھڑ گئی جس میں پانچ کسان رحمت اللہ، عبدالحق، زرک لہڑی اور عبداللہ لہڑی اور عبدالکریم رخشانی شہید ہو گئے ایک بچے سمیت چار افراد زخمی ہوئے۔ آٹھ افراد لاپتہ ہوئے اور متعدد کسانوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

پٹ فیڈر کسان تحریک کو اس خونی واقعے کے بعد قبائلی جھگڑے کا رنگ دے کر غلط رخ پر لے جانے کے بجائے اسے سیاسی جدوجہد کے طور پر برقرار رکھنے کے لئے مزدور، طلبا، کسان عوامی رابطہ کمیٹی قائم کر دی گئی جس میں سیاسی

پارٹیاں، طلبہ تنظیموں، مزدور اور خواتین انجمنیں شامل ہوئیں۔ صوفی عبدالخالق، بلوچ طلبا متحرک ہوئے سندھ سے ایک وفد جس میں محمد رمضان، حمیدہ گھانگھرو، ڈاکٹر جبار خٹک، اور مجید بھائی پٹ فیڈر پہنچ گئے۔ سب نے مل کر سیاسی صورتحال کا جائزہ لے کر کسانوں کے ساتھ مل کر درج مطالبات کی فہرست بنائی۔

1۔ پٹ فیڈر کے کسانوں کے قاتل جاگیر داروں کو گرفتار کر کے سخت سزائیں دی جائیں۔

2۔ بے قصور گرفتار کسانوں کو غیر مشروط رہا کیا جائے۔

3۔ سرسوں کی کٹی ہوئی فصل کی کھلیانوں سے لیویز ہٹا کر کسانوں کو اپنی فصل اٹھانے کا حق دیا جائے۔

کسان تحریک مضبوط کرنے کے لئے طلبہ، کسان، عوامی رابطہ کمیٹی کے ایک وفد نے کراچی، حیدر آباد، سکھر، روہڑی سمیت مختلف علاقوں کا دورہ کر کے لوگوں کو اس تحریک سے جوڑنے کی کوشش کی۔ یوں جدوجہد کا باقاعدہ آغاز میں بھوک ہڑتال شروع کرنے کا اعلان ہوا۔

15 فروری 1978 کو سندھ سے بھوک ہڑتال کے لئے آنے والے محمد رمضان، غلام اکبر اور عمر دین سمیت مقامی رہنماؤں پیر بخش سامت، ملگزار ڈومکی، غلام قادر مینگل، ہزار خان بنگلزئی اور ڈاکٹر احمد حسین کو گرفتار کیا گیا۔ تحریک میں تقویت ہوتے دیکھ کر گرفتار رہنماؤں کو فوجی عدالت میں پیش کر کے انہیں سزائیں دی گئیں۔ احمد حسین، ہزار خان کو سبی جیل میں رکھ کر دیگر رہنماؤں کو مچھ جیل بھیج

گیا گیا۔ تحریک روز بروز پھیلتی جا رہی تھی، سندھ سے آئے ہوئے آصفہ رضوی، حمیدہ گھانگھرو، الطاف الرحمن، محمد سلیم بیگ، پیر شہاب الدین کو بھی گرفتار کر کے مچھ جیل بھیج دیا۔ مچھ جیل میں بھی سیاسی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ 22 جولائی 1978 کو مسلم لیگ کے صوبائی صدر میر مراد جمالی کو کوئٹہ میں قتل کر دیا گیا۔ ایک مرتبہ پھر سیاسی تحریک قبائلی جھگڑے کی رخ اختیار کر گیا۔ سیاسی رہنماؤں کی ہزارہا کوششوں کے باوجود تحریک کا رخ تبدیل ہو گیا۔ سرکار نے سیاسی تحریک کو ٹھنڈا کرنے کے لئے 17 نومبر سے 2 نومبر 1978 تک منعقد اسپیشل جرگے کے تحت اس سانحے کا قبائلی تصفیہ کرا دیا۔ زیر حراست سیاسی کارکن اور کسان آزاد ہو گئے۔ اس تحریک کے بطن سے کسانوں کی ایک تنظیم "بلوچستان بزگر کمیٹی" کے نام سے بنی۔ پیر بخش سامت سے غلام حیدر چھلگری کی صدارت کے دوران طویل عرصے تک متحرک رہی۔ تاریخی سبی میلے میں مویشیوں کے کاروبار پر ٹیکس اور دیگر مسائل اور سیاسی صورتحال میں سرگرم کردار ادا کرتے ہوئے سوویت یونین کے خاتمے کے بعد خطے کے دیگر پارٹیوں اور تنظیموں کی طرح بکھر سی گئی۔

عارف شفیق کہتے ہیں ؛

جو میرے گاؤں کے کھیتوں میں بھوک اُگنے لگی
مرے کسانوں نے شہروں میں نوکری کر لی

☆☆☆

حوالہ جات:

1۔ڈاکٹر عنایت اللہ بلوچ۔ بلوچستان کا مسئلہ۔جمہوری پبلکیشنز۔2014ص167-68

2۔ڈاکٹر شاہ محمد مری۔ بلوچ قوم: قبائلی اور جاگیر داری عہد۔ گوشہ ادب کوئٹہ۔2014ص9

3۔ڈاکٹر سلیم کرد۔ یوسف عزیز مگسی اور بلوچستان ریفارمز موومنٹ۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، 2018ص۔72-73

4۔ڈاکٹر شاہ محمد مری۔ میر یوسف عزیز مگی (عشاق کے قافلے) سنگت اکیڈمی آف سائنسز کوئٹہ 2009ص۔66

5۔عبدالرحمن غور۔ نغمہ کوہسار۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔2013ص164

6۔احمد سلیم۔ بلوچستان آزادی سے صوبائی بے اختیاری تک،جمہوری پبلکیشنز لاہور۔ 2013ص۔258

7۔ محمد رمضان۔2009ص۔34

8۔ محمد رمضان۔پٹ فیڈر کسان تحریک۔ بھنڈاہاری سنگت حیدر آباد۔2009ص21

کتابیات:

1۔سید حاکم علی شاہ،2013،بلوچستان جے قدیم آثارن جی ڈائریکٹوری،سندھی لینگوئج اتھارٹی،حیدرآباد

2۔ڈاکٹر مبارک علی،2008،تہذیب کی کہانی،پتھر کا زمانہ،سانجھ پبلیکشنز،لاہور

3۔سنگی،2009،بلوچستان تنازعات و محرکات،سنگی ڈویلپمنٹ فاؤنڈیشن،اسلام آباد

4۔ڈاکٹر انجم رحمانی،1998،پنجاب تمدنی و معاشرتی جائزہ،زاہد بشیر پرنٹرز،لاہور

5۔فاروق بلوچ،2012،بلوچستان کے تہذیبی نقوش،فکشن ہاؤس،لاہور

6۔ش ضحیٰ،1975۔ہمارا بلوچستان،بولان بک کارپوریشن،کوئٹہ

7۔میاں آصف خورشید،2010،مجسموں کی دنیا،فکشن ہاؤس،لاہور

8۔محمد رضا بلوچ،2012،بلوچستان تہذیبوں کا گہوارہ،قلات پبلشرز،کوئٹہ

9۔شاہ محمد مری،2013،بلوچ قوم،عہد قدیم سے ریاست کی تشکیل تک،سٹی بک پوائنٹ کراچی

10۔شاہ محمد مری،2016،بلوچ مہر گڑھ سے تشکیل ریاست تک،سنگت اکیڈمی کوئٹہ

11۔اے ڈبلیو ہیوز،2011،(مترجم انور رومان) سرزمین بلوچ،گوشہ ادب کوئٹہ

12۔فاروق بلوچ،2012،خان اعظم میر نصیر خان نوری فکشن ہاؤس،لاہور

13۔ملک سعید دہوار،1990،تاریخ بلوچستان،نساٹریڈرز،کوئٹہ

14۔ڈاکٹر واحد بخش بزدار،2008،بلوچی زبان،لسانی تاریخ وارتقاء،مرکز مطالعہ پاکستان جامعہ بلوچستان کوئٹہ

15۔ آغا گل،2010،بلوچی بائبل کی کہانی،ایررکسن پرنٹرز،لاہور

16۔ عنایت اللہ بلوچ،1987، دی پرابلم آف گرنیٹیئر بلوچستان، جی ایم بی ایچ سٹینٹ گرٹ،جرمنی

17۔مظہر علی لاشاری،2001،بلوچ تاریخ کے آئینے میں،مرکز علم وعرفان،لاہور

18۔ میر خدابخش مری،1985، دی سرچ لائٹس آف بلوچیز اینڈ بلوچستان، نساٹریڈرز کوئٹہ

19۔جان محمد دشتی،1988،این ایسے آن نیشنل سٹرگل اِن بلوچستان،گوشہ ادب، کوئٹہ

20۔ سلیم خان گمی،1990،بلوچی ادب،بلوچ۔ثقافت،مطبوعات النساء،کوئٹہ

21۔مولاناعبدالکلام آزاد،2012،اصحاف کہف ویاجوج ماجوج،مکتبہ جمال،لاہور

22۔میر گل خان نصیر،1998،کوچ وبلوچ،سیلزاینڈ سروسز،کوئٹہ

23۔احمد یاربلوچ،2007،تاریخ بلوچ وخوانین بلوچ،العصر پبلی کیشنز،لاہور

24۔میر احمد یار،1975،ان سائیڈ بلوچستان،رائیل بک کمپنی،کراچی

25۔ڈاکٹر عبدالرحمن براہوئی،2009،بلوچستان اور پاکستان کی الحاق کی کہانی،قلات پبلشرز،کوئٹہ

26۔ڈاکٹر حمید بلوچ،2012، بلوچ،افغان، پرشین باؤنڈری کیس، سید ہاشمی ریفرنس لائبریری، کراچی

27۔ کامران اعظم سوہدروی،2007، بلوچ قبائل، تخلیقات، لاہور

28۔ میر نصیر خان احمد زئی،1988، تاریخ بلوچ و بلوچستان (جلد دوئم) بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

29۔ مولائی شیدائی،1994، سرزمین بلوچ، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

30۔ تاج محمد بریسگ،2004، بلوچ نیشنلزم، رائل بک سٹی، کراچی

31۔ مولانا نور احمد فریدی،2002، بلوچ قوم اور اس کی تاریخ، قصر الادب، ملتان

32۔ماریہ ملک،2013، بلوچستان کو نونڈرم: دی رئیل پرسیکٹو، پورب اکیڈمی، اسلام آباد

33۔ عنایت اللہ بلوچ،2014، مترجم (ریاض محمود انجم) بلوچستان مسئلہ، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور

34۔ اثیر عبدالقادر شاہوانی،2012، بلوچی زبان وادب، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

35۔ محمد سردار خان بلوچ، (مترجم انور رومان) بلوچ قوم، نسل کی تاریخ، گوشہ ادب، کوئٹہ

36۔ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی،2015، بلوچ ان سرچ آف ائیڈ نٹٹی، وریسفکز، واشگنٹن

37۔ نصیر دشتی،2017، دی بلوچ کنفلیکٹ ود ایران اینڈ پاکستان، ٹرافورڈ، امریکہ

38۔ونسنٹ اے سمتھ،2001، قدیم تاریخ ہند (مترجم محمد جمیل الرحمن)

تخلیقات، لاہور

39۔ ہیروڈوٹس، 2013، دنیا کی قدیم تاریخ، نگارشات پبلشرز، لاہور

40۔ ملک اللہ بخش، 2014، بلوچ قوم کی تاریخ کے پریشان اوراق، بولان بک کارپوریشن، کوئٹہ

41۔ محمد عرفان گبول، 2014، گبول قبیلہ: عہد قدیم سے عصر حاضر تک، ادارہ تحقیق، علی پور

42۔ ڈاکٹر عبدالرحمن براہوئی، 1990، بلوچستان میں عرب فتوحات، قلات پبلشرز، کوئٹہ

43۔ ڈاکٹر عبدالرحمن براہوئی، 2014، بلوچستان میں صحابہ کرام، براہوئی اکیڈمی کوئٹہ

44۔ ڈاکٹر ایم آر ساہنی، 2014، انسانی ارتقاء، بک ہوم، لاہور

45۔ فاروق بلوچ، 2012، بلوچ اور ان کا وطن، فکشن ہاؤس، لاہور

46۔ ڈاکٹر قاسم راھموں، 2013، شاہ جو گنج، روشنی پبلی کیشنز، کنڈیارو

47۔ مرزا قلیچ بیگ، 2007، شاہ جو رسالو، سندھی لینگویج اتھارٹی، حیدر آباد

48۔ اللہ داد جنجھی، 2008، شاہ جو گنج، کویتا پبلی کیشنز، حیدر آباد

49۔ آغا سلیم، 1990، شاہ جو رسالو، لوک ورثہ، اسلام آباد

50۔ جی ایم سید، 2013، پیغام لطیف، فکشن ہاؤس، لاہور

51۔ ڈاکٹر میمن عبدالحمید سندھی، 1994، سندھ جے تاریخ جاو کھریل ورق، مہران

اکیڈمی، حیدر آباد

52۔ اعجاز الحق قدوسی، 2004، تاریخ سندھ، اردو سائنس بورڈ، لاہور

53۔ خواجہ نظام الدین، 2008 (ترجمہ محمد ایوب قادری)، طبقاتِ اکبری، اردو سائنس بورڈ، لاہور

54۔ میر گل خان نصیر، 2010، تاریخ بلوچستان، قلات پبلشرز، کوئٹہ

55۔ ڈاکٹر محمد اسماعیل البوشہری، 2008 (ترجمہ محمد صادق بلوچ) بلوچ تاریخ و عرب تہذیب، آزات جمالدینی اکیڈمی، کراچی

56۔ سردار خان گشکوری، 1967 (مترجم غفار ندیم) چاکر اعظم، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

57۔ مولائی شیدائی، 2008، جنت السندھ، سندھیکا اکیڈمی، کراچی

58۔ شاہ محمد مری، 1998، بلوچ عہد قدیم سے عصر جدید تک، تخلیقات، لاہور

59۔ الفت نسیم، 2008، چند تاریخی گوشے، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

60۔ ناصر عسکری، 1996 (ترجمہ۔ غوث بخش صابر) سیستان و بلوچستان، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

61۔ راجیوراؤ، 2003، ہندی لغت، سچیت کتاب گھر، لاہور

62۔ میر نصیر خان احمد زئی، 1985، تاریخ بلوچ و بلوچستان (جلد اول) بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

63۔ ایضاً۔ 1988۔ ایضاً۔ (جلد دوئم) ایضاً

64۔ ایضاً۔ 1988۔ ایضاً۔ (جلد سوئم) ایضاً

65۔ ایضاً۔ 1993۔ ایضاً۔ (جلد چہارم) ایضاً

66۔ ایضاً۔1998۔ ایضاً۔(جلد پنجم)ایضاً

67۔ ابوالفضل، آئین اکبری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

68۔ میجر ایچ جی راورٹی، 1888، نوٹس آن افغانستان اینڈ پارٹس آف بلوچستان، آئرے اینڈ سپاٹس ووڈے، لندن

69۔ غوث بخش صابر، 2008، پاکستان کا ثقافتی انسائیکلو پیڈیا بلوچستان، لوک ورثہ، اسلام آباد

70۔ محمود نظامامی، 2007، تعارف تذکرہ، لاہوت، حیدر آباد

71۔ میر علی شیر قانع ٹھٹھوی، 2008، تحفتہ الکرام، سندھی ادبی بورڈ، حیدر آباد

72۔ بدر ابڑو، 1991، ہنگلاج ایں لاہوت ڈنڈ ستھائن جے پس منظر میں، سنگم پبلی کیشنز کراچی

73۔ ایم لانگ ورتھ ڈیمز، 1988، پاپولر پوئٹری آف بلوچیز، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

74۔ علامہ غلام مصطفی قاسمی، 2009، شاہ جو رسالو، مہران اکیڈمی، شکارپور

75۔ منظور احمد قناسرو، 2009، شاہ عبدالطیف بھٹائی حیات وافکار، سندھیکا اکیڈمی کراچی

76۔ بدر ابڑو، 2014، سندھ جو شاہ، روشنی پبلی کیشنز، کیڈیارو

77۔ شاہ محمد مری، 2017، شاہ لطیف بھٹائی، سنگت اکیڈمی، کوئٹہ

78۔ ڈاکٹر رخمان گل پالاری، 2017، سردیسی میں بلوچی زبان، کیچ ماضی حال مستقبل، نظامت ثقافت بلوچستان، کوئٹہ (مرتب پناہ بلوچ)

79۔ محمد حسن بلوچ، بلوچستان ءِ جغرافیہ، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

80۔ عبدالرحمن غور، 2013، نغمہ کوہسار، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

81۔ سید رکھیل شاہ، 2007 (اشاعت ہفتم) بحر العشق آزاد کمیونیکشنز، کراچی

82۔ سید چیزل شاہ، 2004 (اشاعت سوئم) بحر العمیق، آزاد کمیونیکشنز، کراچی

83۔ الفت نسیم، شاہ سیر واہ، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

84۔ صوفی پہلوان فقیر، 2011 (اشاعت سوئم) دعوت العشق، آزاد کمیونیکشنز، کراچی

85۔ صوفی فیضل فقیر، ندارد، فیض العشق، مسودہ

86۔ صوفی محرم فقیر، 2002، دیوان مشتاقین، ندارد

87۔ شاہ محمد مری، 2004، بلوچ قوم قبائلی جاگیر داری عہد، گوشہ ادب کوئٹہ

88۔ ڈاکٹر سلیم کرد، 2018، یوسف عزیز مگسی اور بلوچستان ریفارمز موومنٹ، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

89۔ محمد رمضان، 2009، پٹ فیڈر تحریک، بھنڈار ہاری سنگت، حیدر آباد

90۔ احمد سلیم، 2013، بلوچستان آزادی سے صوبائی بے اختیاری تک، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور

91۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیئر، بولان

92۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیئر، چاغی

93۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیئر، جھالاوان

94۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر، کچھی

95۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر، خاران

96۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر، لسبیلہ

97۔۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر، لورالائی

98۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر، مکران

99۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر، کوئٹہ پشین

100۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر، ساراوان

101۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر، سبی

102۔ڈسٹرکٹ گزیٹیئر، ژوب

103۔اپریل گزیٹیئر آف انڈیا، بلوچستان پروفیشنل سیزیز، اورنٹیل پبلشرز، لاہور

104۔کالکار بخش قانون گو، ندارد، شیر شاہ سوری کا عہد، عہد بک ڈپو، لاہور

105۔اخبارات ورسائل وجرائد

106۔انٹرنیٹ۔